کشمنجا (یارخون لشت) سے گنج آباد
(بورتھ) تک۔ واخان کوریڈور کے

تحریر: مسعود احمد خان

فہرست

مارمٹ

مستوج بچی!

نانگا پربت: لاتبو۔ جنوب کی طرف سے

دیباچہ

کہا جاتا ہے سفر وسیلۂ ظفر۔ مذہباً بھی ہمیں ''سیرو فی الارض'' کی تلقین کی گئی ہے تاکہ ہم مختلف اَن دیکھے مقامات پر جائیں اور وہاں کے رہنے والوں کی بود و باش اور طرزِ معاشرت کا بغور جائزہ لیں۔ اِن کے رسوم و رواج کا مطالعہ کریں اُن کے تمدّن اور کہنہ روایات کو پرکھیں یہاں تک کہ اپنا اور دوسروں کا موازنہ سامنے آجائے اور اِس اَمر کا تعین ہو سکے کہ ایک ہی ملک کا معاشرتی و اقتصادی تفاوت کیا ہے اور اِسے کیسے دور کیا جاسکتا ہے۔ اِس کاوشِ حقیر کی قطعاً خواہش نہ تھی لیکن کسی ایک سفر کے بعد اپنے احباب سے تذکرہ اِس اَمر پہ منتج ہوا کہ اپنے تجربات و سفری مسائل کو تحریر میں لایا جائے۔ چوہدری محمد اعظم جاوید ایڈوکیٹ کی مسلسل تاکید، سردار مظفر خان مگسّی کی حوصلہ افزائی اور محترم رحمان فراز صاحب کی ادبی رہنمائی اِن سطور پہ منتج ہوئی۔ اِن احباب کے علاوہ میں اپنے سفری ساتھی عمار آصف، ڈاکٹر عبداللہ خان، فیض اللہ خان اور عبید اللہ خان کا خصوصاً مشکور ہوں کہ سفری مسائل میں اِن کی برداشت اور معاملات کو سلجھانا اور اُن کی بذلہ سنجی ہمیشہ مشکلات کو مسکراہٹوں میں بدل دیتی تھی۔ عمار آصف کے علاوہ باقی تین حضرات میرے ماموں زاد ہیں اور ایک سے زیادہ مقامات پر ہم سفر رہے ہیں پس ایک دوسرے کی طبیعت سے واقف ہیں۔ پس اِن صاحبان کی تحریک بھی اِس تحریر کا باعث ہوئی۔ زندگی میں ایک سے زیادہ پہاڑی، چولستانی اور میدانی سفر کیے گئے لیکن اِس خاص سفر کو ضبطِ تحریر میں لانا اِس لیے لازم جانا کہ یہاں آپ کی آزمائش انواع و اقسام کی زمینی سطحوں

terrains سے ہوتی ہے۔یعنی کہ پر خطر ڈھلوانیں، برفیلی دراڑیں، تیز وتند دریا، ریگستان اور پہاڑی دَروں کے لمبے فاصلے جن کو آپ نے مخصوص وقت میں طے کر کے ہی محفوظ جگہوں تک پہنچنا ہوتا ہے ایک تجربہ اور برداشت ہے۔۔اُمید ہے کہ یہ تحریر اِس قسم کے excusrsion کرنے والوں کے لیے رہنما ثابت ہوگی۔

مسعود احمد خان

الحبیب۔ملتان

جنوری ۲۰۱۴ء

تعارف

جناب زندگی میں کوئی کارنامہ تو ہے نہیں لیکن بھلا ہو قسمت کا کہ بہاء الدین زکریا یونیوسٹی کے حیاتیات (Zoology) کے شعبہ میں داخل ہونے کا موقع مل گیا۔ حیاتیات کے شعبہ میں دو طویل تعلیماتی دورے (Long Study Tours) لازم ہوتے ہیں جن میں آپ کے لیے Zoogeography, Ecological topographical study and relative adaptations ofanimals in Study and Environment,& anatomical and physiological adaptations کی کافی اہمیت ہوتی ہے۔ اس طرح آپ کو مختلف مظاہر کو جاننے کے ساتھ ساتھ سماج کو بھی سمجھنے کا موقع مل جاتا ہے۔

نانا ڈاکٹر عبدالواحد خان مرحوم نے ۱۹۸۲ء میں مڈل کے امتحان سے فراغت کے بعد ماموں عزیز الرحمان خان مرحوم کو میرے ہمراہ کرتے ہوئے حکم صادر فرمایا کہ مسعود کو ملتان سے بذریعہ لاہور، کوہسار مری تک کا سفر کرایا جائے۔ ماموں جان نے اس فرضِ عین کو بالکل ''عوامی'' طریق سے نہایت مستحسن انداز میں سرانجام دیا۔ مثال کے طور پر اگر آپ چوبرجی میں رہائش پذیر ہیں اور صبح آپ نے قذافی اسٹیڈیم کا ''دورہ'' کرنا ہو یا کامران کی بارہ دری، تو آپ پر لازم ہے کہ صبح چار بجے گھر سے تیار ہو کر مطلوبہ جگہ تک چھ بجے تک رسائی حاصل کریں اور راستے میں کہیں بھی سڑک کنارے تھڑے والے ہوٹل کے ناشتہ سے لطف اندوز ہوں اور اس طرح اپنے ''دورہ'' کو مکمل کریں۔ اللہ تعالیٰ اِنھیں غریق رحمت فرمائے! اُن کے اِس عمل سے بارہ سال کے بچے کے لیے زندگی میں پیدل چلنا مانع نہیں رہا۔ ۱۹۸۲ء کے اوائل میں کہسار مری اور اِس کی دلفریب برف باری ایسی دل میں کھبی کہ پہاڑ اور اُن کی پُرشکوہ بلندیاں دیکھنا زندگی کی خواہش سا بن گیا۔ سونے پہ سہاگہ زوآلوجی کے سالانہ اسٹڈی ٹور نے کیا۔ شاہراہ قراقرم پر درۂ خنجراب تک اور سکردو

اور اِس کے گردونواح نے پاکستان کے شمال مغربی حصہ کو دیکھنے کا موقع فراہم کیا۔ نانگا پربت ایک شان سے زمین کے سینہ پر ایستادہ ہے اور دامن دل اپنی طرف کھینچتا ہے۔ اِس کی قربت کی خواہش نے کبھی تو ہمیں رائے کوٹ سے بذریعہ فیری میڈو *Herman Bhul* (پہلا آسٹرین شخص جس نے نانگا پربت سر کی) کی یادگار واقع بیال کیمپ تک پہنچایا اور کبھی اَستور کے راستے اِس ننگے پہاڑ (نانگا پربت) کا طواف کرنے کے لیے *Herligkaufer* (پولینڈ کا کوہ پیما) کیمپ سے مزینو ہائی کیمپ واقع ۱۷۰۰۰ ہزار فٹ یا ۵۱۱۸ میٹر تک پہنچنے کی سعی کی گئی۔ کبھی ہوپر ویلی (ہنزہ۔ کریم آباد) کو اَحباب کے ساتھ، نلتر ویلی (گلگت) تو کبھی کوئٹہ بلوچستان بذریعہ لورالائی یا پھر ژوب سے خیبر پختو خواہ کوہ سلیمان کی تنگ گھاٹیوں سے گزرنا یا پھر چمن کا سفر بذریعہ ریل گاڑی شیلا باغ (پاکستان کی سب سے بڑی ریل سرنگ) گزر کر گلستان و بوستان سے ہوتے ہوئے یا براستہ سڑک درہ کھوجک کو عبور کرنا اور قندھار۔ افغانستان تک (طالبان کی حکومت میں) بغیر ویزا سفر زندگی کے کچھ مواقع ہیں جو قدرت نے فراہم کیے۔ اِس مملکت خداداد پاکستان کو اللہ تعالیٰ نے ایک ہی وقت کے دوران مختلف موسمی تغیرات (صحرا، جنگل، میدان، برف پوش چوٹیاں، دریا وغیرہ) سے نوازا ہے جو کہ بہت کم ممالک کی قسمت میں ہے۔ جون کے مہینے میں پنجاب اور سندھ کے تپتے ہوئے میدان وصحرا اور شمال میں اسی مہینہ میں برف باری یہیں کا خاصہ ہے۔ پٹھانوں کے جدامجد قیس عبدالرشید کی آخری آرام گاہ واقع تخت سلیمان ڈیرہ اسماعیل خان اور بہت سے مقامات کو دیکھنا ابھی تشنہ ہے۔

اِس تحریر کو لکھنے کی تحریک، جیسے کہ دیباچہ میں تحریر کیا گیا ہے، میرے احباب ہیں جنہوں نے یہ باور کرایا کہ بلند پہاڑوں کی پگڈنڈیوں (*High Altitude Trekking*) میں پیدل سفر کے حوالے سے جو مسائل و تکالیف و فوائد ہیں اِنہیں اپنے تجربہ کی بنیاد پر بیان کیا جائے گرچہ انگریزی میں اِس حوالے سے بے انتہا مواد موجود ہے کیونکہ اِس قسم کی آوارہ گردی اور تکالیف کا خندہ پیشانی سے سامنا کرنا یورپی، پہلی اقوام اور امریکیوں کا ہی وطیرہ ہے۔ اِس سال جولائی ۲۰۱۲ء کے سفر کا انتخاب موزوں جانا جو کہ ۲۲ جولائی ۲۰۱۲ء کشمنجا (یارخون لشت۔ چترال) سے پیدل شروع ہوا اور ۲۹ جولائی ۲۰۱۲ء گنج آباد (بورتھ۔ گلگت بلتستان) پہ اختتام پذیر ہوا۔ تحریر کے آغاز میں آپ کے لیے سامان ولوازمات، جو کہ اِن بلند پہاڑی پگڈنڈیوں پر ضرورت ہوتے ہیں، کا تذکرہ لازم ہے اور اِس کے بعد سفر کے دواران حالات و واقعات جو شاید آپ کی دلچسپی کا باعث

ہوں، بیان ہیں۔تحریر میں خامی کی وجہ بندۂ ناچیز کا مصنف نہ ہونا ہے۔اس کے لیے پیشگی معذرت خواہ ہوں۔

مملکتِ خداداد پاکستان کو قدرت نے بہت سی نعمتوں سے نوازا ہے جن میں دُنیا کے بلند پہاڑوں کے سلسلے ہندوکش، قراقرم و ہمالیہ ہیں۔ اِن پہاڑوں میں تقریباً بیالیس کے قریب سات ہزار میٹر یا تئیس ہزار فٹ سے زائد بلند چوٹیاں ہیں اور اِن میں سے بہت سی ایسی ہیں جو کہ Virgin Peaks کہلاتی ہیں یعنی کہ ابھی تک حضرتِ انسان نے اُن پر قدم رنجہ نہیں فرمائے۔ یہ بلند قامت پہاڑ زمین کے اِس خطہ کو دنیا کے دوسرے علاقوں یا ممالک سے ممتاز کرتے ہیں۔اِن چوٹیوں کو سر کرنا ہو یا بلند پگڈنڈیوں کی ''صحرانوردی'' آپ کے پاس وافر مواقع ہیں۔تاہم اِس سب کچھ کے لیے آپ کو ایک جامع منصوبہ بندی کے ساتھ ساتھ کچھ تیاری کی بھی لازماً ضرورت ہے۔ یہ تیاری کیل کانٹا ساتھ ہونے کے علاوہ جسمانی اہلیت کو بڑھانا بھی ہوگی کیونکہ میدانی یا شہری زندگی اور بلند پہاڑوں کی wilderness میں پھرنا ایک مختلف تجربہ ہے۔آپ کو لمبے فاصلوں کے طے کرنے کے علاوہ مختلف زمینی و موسمی تغیرات سے بھی نبرد آزما ہونا ہوگا۔مثال کے طور پر جون جولائی میں آپ کا واسطہ بہت زیادہ بارش یا برف باری سے پڑ سکتا ہے یا شفاف آسمان سے Ultraviolet rays اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ آپ کی رنگت کو گہرا dark کرنے پہ مصر ہوسکتی ہے اور چند روز بعد یہ ممکن ہے کہ Sun burn کی وجہ سے آپ اپنے آپ کو بھی نہ پہچان سکیں۔بعض مقامات پر بلند قامت پتھریلی چٹانیں آپ کے راہ میں حائل ہوں گی اور آپ کے لیے کوئی دوسرا چارہ نہیں کہ اِنہی کے ساتھ ساتھ چھپکلی کی طرح چپک چپک کر اپنی منزلِ مقصود تک پہنچا جائے۔کہیں آپ کا واسطہ ڈھیلی ڈھالی مٹی یا بجری Loose gravel والی عمودی غیر ہموار چٹانوں سے ہوگا جن کی گہرائیوں میں شور کرتا ہوا تیز دریا یا پھر حدِ نگاہ تک اَتھاہ گہرائی آپ سے تقاضا کرے گی کہ اِس کی عزت کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے احتیاط کے ساتھ اپنا تھوڑا سا راستہ بناتے ہوئے گزر جائیں۔

اِن سارے معاملات سے نبٹنے کے لیے کچھ اشیاء نہایت اہمیت کی حامل ہیں۔اِن کا اہتمام آپ کے لیے لازم اور ممد ہوگا۔

ا۔ایک اچھی گرم اَستر والی واٹر پروف جیکٹ،

۲۔ ہلکے وزن والی برساتی،

۳۔ گرم کپڑوں کے دو سوٹ۔ جین والی پتلون اچھی پسند ہے،

۴۔ تغیراتی موسم سے نبٹنے کے لیے ہلکے کپڑوں کے دو سوٹ لازماً ہوں کیونکہ زیادہ بلندی پر سردی سے واسطہ پڑے گا اور کم بلندی پر آپ کو تپش سے نبرد آزما ہونا ہوگا،

۵۔ مضبوط تلوے (Sole) والے واٹر پروف بوٹ، جو کہ آپ کو پتھر، مٹی، ریت، برف، پانی وغیرہ سے بچائیں گے،

۶۔ ایک جوڑا کینوس کے بوٹوں کا،

۷۔ دو یا تین گرم جرابوں کے جوڑے،

۸۔ ایک چھوٹا کمر پہ باندھنے والا تھیلا (Backpack)

۹۔ واٹر پروف سلیپنگ بیگ جو یا تو پروں (Down feather) والا یا اچھے پولی ایسٹر والا ہو،

۱۰۔ پانی کی بوتل،

۱۱۔ اچھی ٹارچ،

۱۲۔ گہرے شیشوں والی عینک (Dark Sun Glasses)،

۱۳۔ ہیٹ یا سوتی رومال،

۱۴۔ ٹریکنگ اسٹکس trekking sticks، ۹ ایم ایم کا رسہ، چاقو، پلاس، چھوٹی ہتھوڑی،

۱۵ Water proof Rucksacks رُک سیک جو کہ لازماً واٹر پروف ہو،

۱۶۔ایک عدد گیس سلنڈر،ٹریکنگ ٹیم کی ضرورت کے مطابق چمچے،پلیٹیں،کپ،ماچس کی ڈبیایالائٹر،وغیرہ،

۱۷۔اور سب سے اہم فولڈنگ واٹر پروف کیمپ جو کہ آپ کے گروپ کے مطابق ہوگا،

۱۸۔کھانے و مشروب کے ٹن پیک،نوڈلز،پکے پکائے ایلومینیم میں پیک مختلف کمپنیوں کے کھانے جو کہ آسانی سے دستیاب ہیں،کھجور،چاکلیٹ وافر تعداد میں کیونکہ یہ توانائی کو بحال کرنے میں بہت مددگار رہے،بھی چاہیے ہوں گے۔

یہ سامان کی کچھ تفصیل ہے جس کی عمومی طور پر بلند راستوں High Altitude Trekking پر ضرورت پڑتی ہے۔اگر آپ چاہیں تو اپنے لیے کچھ اور لوازمات بھی ساتھ لے سکتے ہیں لیکن اِس چیز کا خیال رہے کہ غیر ضروری اشیاء وزن میں اضافہ کا باعث ہوتی ہیں جو کہ اِن بلندیوں پر کوئی ''اچھا'' نہیں۔

اَب آیئے جسمانی تیاری کی طرف،اِن ٹریکس پر رخت سفر باندھنے سے تین چار ماہ پہلے اگر چار سے پانچ میل تک روزانہ جاگنگ کرلیں تو نہایت آسانی ہوگی۔لیکن ایک اہم بات ذہن نشین کرلیں کہ بہت اچھی صحت اور تیاری کے باوجود آپ کی طبیعت متغیر ہوسکتی ہے اِس صورت حال میں آپ کو آرام کرنا ہے اور اگر زیادہ بلندی پر ہیں تو فوراً نیچے آئیں یعنی کہ بلندی کو کم کریں۔زیادہ چڑھائی پر آہستہ رفتار بہتر رہتی ہے اور خاص طور پر پینتیس سو میٹر سے بلند ٹریکس پر نہایت احتیاط سے کام لینا ہوگا۔کچھ علامات مثلاً غیر متوازن سانس،خود کو بیمار محسوس کرنا،کمزوری،سر کا درد،جسم کے کسی حصہ میں وَرم خاص طور پر آنکھوں،انگلیوں یا پیروں پر،خشک کھانسی،متلی،ٹانگوں کا کانپنا،بھوک کا اُڑ جانا یا چکر آنا ہو تو آپ پر لازم ہے کہ اُسی جگہ پر رہائش کا بندوبست کریں اور اگر یہ علامات دُور نہ ہوں تو بغیر کسی سوچ بچار کے فوراً اپنی بلندی کو کم کریں۔پینتیس سو میٹر یا اِس سے زیادہ بلندی پر یہ علامات کسی بھی عمر کے شخص پر ظاہر ہوسکتی ہیں اِس لیے احتیاط لازم ہے۔

آغازسفر

جون ۲۰۱۲ء کے اِختتامی ہفتہ میں اَحباب عزیزی ڈاکٹر محمد عبداللہ خان، محمد فیض اللہ خان اور عبید اللہ خان کے سامنے محترم عمار آصف کے فون کا تذکرہ کیا گیا جنہوں نے پوچھا تھا ''کہ ہم نے رختِ سفر کب باندھنا ہے؟'' اِن کو ایک سال پہلے ایک ملاقات میں بندہ نے پیشکش کی تھی کہ ہمارے ساتھ شمال کا سفر کریں جو کہ ہر سال کہیں نہ کہیں ہم پاکستان میں کرتے ہیں۔ کبھی تو یہ ایک مکمل High Altitude Trekking پندرہ سے بیس دِنوں پہ مشتمل ہوتا ہے یا ایک ہلکا سفر Light sojourn جو کہ فورٹ منرو کی جنوبی پہاڑیوں میں بزکشی کے مقام تک چند گھنٹوں کی ٹریکنگ ۔ اِس سال کا پروگرام میرے خیال کے مطابق نانگا پربت کے طواف (round about) کا تھا جو کہ اَستور سے تریشنگ ،رُوپل ،اَپر رُوپل ، ہرلگ کاؤ فر کیمپ ، بزین گلیشیئر ، لاتبو ، مازینو گلیشیئر ، مازینو بیس کیمپ ، مازینو ہائی کیمپ ،لوئیا میڈو ، بیال کیمپ ، فیری میڈو سے ہوتے ہوئے بذریعہ تاتو ، رائے کوٹ برج قراقرم ہائی وے پر نکلنا تھا۔ یہ ٹریک تقریباً بیس سے پچیس دِن کا تھا اور تقریباً سترہ ہزار فٹ یا باون سو میٹر بلند مزینو ہائی کیمپ کو عبور کرنا تھا جو کہ ایک مشکل Strenuous لیکن سیدھے ٹریک میں شمار کیا جاتا ہے۔ لیکن عزیزی محمد فیض اللہ خان نے رائے دی کہ پچھلے سال ہم نے چترال کے شمال میں بذریعہ مستوج ، بونی اور یارخون لشت سے ہوتے ہوئے کشمنجا بروغل پاس تک کا سفر کیا تھا۔ اِس دفعہ اگر ہم اِس سے آگے کرومبر لیک Karomber Lake (واقع پندرہ ہزار فٹ یا چار ہزار پانچ سو میٹر بلند) سے ہوتے ہوئے چلنجی پاس Chillinji Pass (واقع باون سو میٹر یا سترہ ہزار فٹ) سے گزر کر بوئنر ، بابا غنڈی زیارت ، یشکک ، ریشت ، سومایار ، کیمن سپینز بیڈج ، رامنج ، خدا آباد سے ہوتے ہوئے سوست (جو کہ کسٹم پوسٹ بھی ہے) جا نکلیں ۔ اِس طرح وہ خنجراب پاس بھی دیکھ لیں گے اور بذریعہ عطا آباد ، ہنزہ قراقرم ہائی وے پر گلگت پہنچا

جائے تو کیسا رہے گا۔ پس اِس پر سب متفق ہوئے اور منصوبہ کو حتمی شکل دی گئی اور تیاری شروع کر دینے کے ساتھ ساتھ عمار آصف کو بھی آگاہ کر دیا گیا تاکہ ہم ۱۳ یا ۱۴ جولائی کو ملتان سے روانہ ہو سکیں اور رمضان المبارک، جو کہ ۲۲ جولائی کو شروع ہو رہا تھا، کے چند روزوں کی قربانی ہو۔ لیکن ہمارا سفر ۱۵ جولائی کو ملتان سے شروع ہوا اور ہم بذریعہ پشاور براستہ لوئر دیر، لواری پاس سے ہوتے ہوئے چترال ۱۷ جولائی کی صبح پہنچے۔ لواری ٹنل عمومی طور پر سردیوں میں کھولی جاتی ہے کیونکہ برف باری کی وجہ سے چترال کا زمینی راستہ یہی رہ جاتا ہے۔ ویگن کے ڈرائیور نے ٹنل سے جانے کی چترال اسکاؤٹس سے جو کہ اس کی حفاظت پر مامور ہیں درخواست کی لیکن یہ رد کر دی گئی۔ پس لواری ٹاپ سے ہوتے ہوئے دو گھنٹے کی زیادہ مسافت کے بعد چترال پہنچا گیا۔ ہماری حکومتوں کے معیارات بھی ایسے ہی ہیں جن کا عوام کی فلاح و بہبود سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ ایک عرصہ بیت گیا ہے کہ اِس سرنگ پہ کام ہے کہ ختم ہونے کو نہیں آ رہا جس کی وجہ سے مقامی لوگ پاکستان اور حکومت سے شکایت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اور بعض اوقات اُن کا سوال ہوتا ہے کہ کیا یہ علاقہ پاکستان کا حصہ نہیں ہے؟ معلوم نہیں کب ہم من حیث القوم ایک اِکائی بن سکیں گے یا اِیسے ہی مختلف قومیتوں میں بٹے رہیں گے۔ جاتے ہی ہوٹل میں آرام کی غرض سے سب کمروں میں گھس گئے کیونکہ سبھی احباب ۴۸ گھنٹے کی مسلسل بس و ویگن کی مسافت کے باعث، اور وہ بھی کچے پکے راستوں پر، تھک چکے تھے۔ شام کو بازار میں گھوم پھر کر وقت گزارا گیا۔ چترال میں تمام شمالی علاقوں کی طرح مغرب کے بعد بازار بند ہو جاتے ہیں اور رات دیر تک مارکیٹ کے کھلے رہنے کا رواج نہیں ہے۔ اگلے دِن یعنی کہ ۱۸ جولائی کو یارخون لشت کے لیے سواری کی فراہمی کے حوالے سے معلوم کرنے پر بتایا گیا کہ گاڑی ایک دو روز میں میسر ہو گی۔ پس یہ فیصلہ کیا گیا کہ چترال کی سب سے اونچی جگہ برمولشت ایک دِن گزارا جائے۔ بذریعہ ٹیکسی وہاں تک رسائی حاصل ہوئی۔ یہ جگہ تقریباً دس ہزار فٹ اُونچی ہے اور یہاں امیر چترال کے پرانے ''محل'' کے کھنڈرات ہیں جن میں کچھ ملازم اپنے خاندانوں کے ساتھ رہائش پذیر ہیں۔ ہم بھی عجیب قوم ہیں کہ اپنی پرانی تعمیرات وثقافت کی حفاظت سے ہمیں کوئی سروکار نہیں ہے۔ یہاں پر کچھ پاکستان ٹیلی کمیونیکیشن PTCL کے آلات بھی نصب ہیں اور ٹی ڈی سی پی کا ایک موٹیل بھی ہے جو کہ ایک جدید تعمیر کا نمونہ ہے۔ یہاں سے آپ پورے چترال کا نظارہ کر سکتے ہیں اور شمال میں ترچ میر Tirch Mir صبح کے وقت تو اپنا دلفریب نظارہ پیش کرتی ہے لیکن بعد میں ہمیشہ بادلوں میں لپٹی رہتی ہے۔ شمال میں کچھ فاصلے پر وائلڈ لائف کا ایک ریسٹ ہاؤس ہے جو کہ

کھنڈرات امیر چترال ۔ برمولشت

وائلڈ لائف ریسٹ ہاؤس ۔ برمولشت

ترچ میر ۔ برمولشت سے

برمولشت میں!

پانچ سوفٹ کی بلندی پر ہے اور یہاں کا موسم بہت ہی بہتر اور چترال سے کافی ٹھنڈا ہوتا ہے۔ آپ چترال میں وائلڈ لائف کے دفتر سے مناسب فیس کے ساتھ یہاں اپنے خاندان کے ساتھ ایک دو روز رہ سکتے ہیں۔ یہاں کے سٹاف نے ہمیں بتایا کہ مارخور، جو کہ پاکستان کا قومی جانور ہے، یہاں کافی تعداد میں ہے اور حکومت پاکستان اور یہ بہتات اِن کے ڈیپارٹمنٹ کی ''کاوشوں'' کا ثمر ہے۔ کاش ہم اِسی طرح پاکستان کی ہر نعمت کو اَپنائیں اور اِس دھرتی کے اَثاثوں کی حفاظت کو یقینی بنائیں۔ یہاں سے چار دن کی پیدل مسافت پر آپ رمبور پہنچ سکتے ہیں جو کہ کیلاش کی تین وادیوں، یعنی کہ بمبوریت اور بریر، میں سے ایک ہے۔ یہ ایک آسان ٹریک ہے اور ایک اچھی تفریح اور ٹریکنگ کے تجربہ کا باعث بن سکتا ہے۔

اگلے دن بمطابق ۱۹ جولائی کو گاڑی ڈرائیور کی یارخون لشت سے آمد پر ہمیں آگاہ کیا گیا کہ کل یعنی کہ ۲۰ جولائی کو وہ لشت کے لیے روانہ ہو گا۔ پس اِس گاڑی میں اپنی نشستوں کو محفوظ کرنے کے بعد باہمی مشاورت سے یہ فیصلہ کیا گیا کہ گرم چشمہ کے لیے نکلا جائے کیونکہ بمبوریت (وادی کیلاش) جانے کے لیے سب کا خیال تھا کہ وہ ایک دن سے زیادہ رہائش کی جگہ ہے۔ گرم چشمہ، افغانستان سے متصل، چترال کے شمال مغرب میں تقریباً چالیس سے پینتالیس کلومیٹر کے فاصلہ پر ایک چھوٹا سا قصبہ ہے جہاں گندھک کا ایک چشمہ ہے جس پر یار لوگوں نے کچھ کمرے تعمیر کر کے ''شفا'' بانٹنے کا کام چند سو روپوں میں مہیا کیا ہوا ہے گرچہ شفا والے پانی سے نہانے کا انتظام نہایت نامناسب ہے۔ اِس جگہ کی اہمیت صرف اِسی وجہ سے ہے۔ چترال واپسی پر تقریباً بیس کلومیٹر کے فاصلہ پر دریا کے پار گاڑی کے ڈرائیور نے ہماری توجہ پندرہ سے سولہ مارخور کے ایک غول کی طرف دلائی جو کہ دوپہر کے وقت دریا پر پانی پینے کے لیے جمع تھا اور ایک نر مارخور اِن سب کے نظم کی ذمہ دار خوش اسلوبی سے نبھاتا ہوا نظر آیا۔ اَحباب نے خوش گواری سے اِس غول کی تصاویر بھی اتاریں اور فلم بند بھی کیا اور سب اِس بات پہ متفق ہوئے کہ حاصل سفر اِس غول سے ''ملاقات'' ہے۔

جمعہ کے دن سب ممبران مکمل طور پر تیار تھے کہ ڈرائیور کی طرف سے اِطلاع موصول ہوئی کہ ہمیں نماز جمعہ کے بعد یارخون لشت کے لیے روانہ ہونا ہے۔ پس نماز شاہی مسجد چترال میں ادا کرنے کے بعد ہم سامان لونگ چیسس ٹیوٹا میں لادنے کے بعد دوسرے مسافروں کے ساتھ تقریباً چار بجے سہ پہر چترال سے روانہ ہوئے۔ ہمارا سفر یارخون

مارخور دریا پر۔ گرم چشمہ۔ چترال

کشمنجا گاؤں سے پہلے

یارخون لشت

گرم چشمہ گلیشیئر سے گلگت کا راستہ

لشت بذریعہ بونی، مستوج سے ہوتے ہوئے تقریباً صبح چھ بجے اِختتام پذیر ہوا۔ حالانکہ چترال سے یارخون لشت کا فاصلہ ۲۶۰ کلومیٹر ہے لیکن مستوج سے آگے سڑک نام کی کوئی چیز نہ ہے ہاں اگر ہے تو خطرناک پتھریلی پہاڑوں کے ساتھ تنگ پگڈنڈیاں! بعض اوقات آپ دریا کے متصل سفر کرتے ہیں اور کبھی آپ کو اِس کے کنارے شور کرتے ہوئے پانی میں سے نہایت احتیاط کے ساتھ گزرنا پڑتا ہے جہاں اکثر مقامات پر مسافروں کو کلمہ طیبہ بھی پڑھنے کی ''ضرورت'' پڑتی ہے۔ اس ''رویہ'' میں مقامی و غیر مقامی کی کوئی تخصیص نہیں! مقامی ہم سفر حضرات درشوار گزار مقامات پر ہم غیر مقامی مسافروں کی توجہ بھی عموماً طور پر چاہتے ہیں کہ اَرباب اِختیار سے اِن کی مشکلات کا اِدراک کرایا جائے! لیکن کیا کیا جائے ہم نے ارضِ پاکستان کو اِس کی پیدائش سے آج تک اَپنانے کی سعی نہیں کی اور کاسہ ءِ گدائی اُٹھا کر اپنے مسائل کا حل دوسروں سے چاہا ہے۔ یہ دُنیا کا مروجہ اُصول ہے کہ گدا گر کبھی بھی ترقی نہیں کر سکتے۔ اور ڈولی پارٹن ۱۹۶۹ء کے نغمہ Coat of Many Colors میں ہمیں سکھاتی ہوئے بتاتی ہے کہ One is only Poor if "Choose" to be! معلوم نہیں کب ہم اپنے پیروں پہ کھڑا ہونے کا اِرادہ کر کے قوموں کی صف میں اپنی توقیر کو حاصل کرنے کی تگ و دو کریں گے!

آغاز ٹریک

یارخون لشت سے بروغل تک

تو جناب رمضان المبارک کا آغاز بمطابق ۲۱ جولائی ۲۰۱۲ء بروز ہفتہ، یارخون لشت پہنچتے پہنچتے ہی ہو گیا تھا۔ہم میں سے کچھ حضرات نے پانی اور چند بسکٹوں کی سحری کے ساتھ ہی راستے میں روزہ رکھ لیا تھا اور یارخون پہنچنے پر ہم نے محترم پریموسوالدین کے مہمان بننے کی ٹھانی جو کہ ایک پڑھے لکھے اِنسان ہیں اور بہت عرصہ تک ایک جاپانی این جی او کے ساتھ میڈیکل اسٹنٹ کے طور خدمات سرانجام دینے کی وجہ سے اِس علاقہ میں ڈاکٹر کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ڈاکٹر عبداللہ خان کے مطابق وہ ایک اچھے میڈیکل اسٹنٹ ہیں اور میڈیکل ایمرجنسی کا اچھا اِدراک رکھتے ہیں۔اُنہوں نے کمال مہربانی سے ہم پانچ لوگوں کے لیے اپنے گھر میں ایک کمرہ مخصوص کیا جو کہ بستروں اور رضائیوں سے مزین تھا۔حالانکہ اُن کے ہاں ڈپٹی کمشنر غذر، والئی غذر پی ٹی وی کی ٹیم کے ساتھ غذر سے بروغل فیسٹول کی فلم بندی کرتے ہوئے رات دس بجے سے مہمان تھے۔پس جن اَحباب نے روزہ نہیں رکھا تھا اُن کے لیے، دوسرے مہمانوں کے ساتھ، ناشتہ کا بھی اہتمام کیا گیا اور ہم لوگ گھوڑے بیچ کر ایسے سوئے کہ ڈھائی یا تین بجے سہ پہر جاگے۔اِفطار کے وقت ہمارے میزبان نے بڑا اہتمام کیا ہوا تھا پس سب حضرات سیر ہو کر طعام سے لطف اندوز ہوئے۔رات کو ہی محترم پریموسوالدین صاحب کو گاڑی (جیپ) کے لیے درخواست کر دی گئی تھی جو کہ ہمیں یارخون لشت سے کشمنجا دریائے یارخون کے سنگم پر لے جائے کیونکہ یہ تقریباً ۳۵ کلومیٹر کے فاصلہ پر ہے اور یہیں سے ہی ہمارے پیدل ٹریک کا آغاز ہونا تھا۔محترم پریموسوالدین سے ٹریکنگ روٹ کے حوالے سے بھی گفتگو ہوئی اور اُنہوں نے ہمیں سختی سے منع کیا کہ ہم چلنجی پاس سے باباغونڈی ہوتے ہوئے سست چیک پوسٹ پر

بروغل پوسٹ

آماجگاہ۔ بروغل پوسٹ

رہائش بروغل پوسٹ

چترال اسکاؤٹس کے ساتھ

نکلنے کا ارادہ ترک کر دیں کیونکہ درہ پر اِس سال کافی برف باری ہوئی تھی اور برف کی بڑی دیوار حائل ہونے کی وجہ سے راستہ ممکن نہیں ہے۔ اِس پر اَحباب نے باہم مشاورت سے سوختر آباد کے راستے بورتھ گنج آباد جانے کا روٹ بھی ذہن میں رکھ لیا۔لیکن یہ فیصلہ ہوا کہ موقع پر پہنچ کر ہی ٹریک کو ترتیب دیا جائے گا۔ پس ہم ۲۲ جولائی کو اپنے مہمان سے اجازت لے کر اپنے اگلے پڑاو کے لیے ساڑھے آٹھ بجے روانہ ہوئے۔ راستہ انتہائی دشوار گذار ہونے کی وجہ سے ہمیں ڈیڑھ گھنٹہ لگ گیا۔اور دس بجے صبح ہم اپنے ٹریک پر روانہ ہوئے۔ قدرت نے اَحباب کو دشوار گذار راستوں سے آگاہی کے لیے شروع میں ہی ایک امتحان سے گذارنا تھا کہ ہمیں اَپنے اَپنے رُک سیک اپنے کندھوں پر اُٹھا کر دریائے یارخون سے متصل ایک نہایت ہی خطرناک مٹی، باریک بجری اور چھپی ہوئی برف کے گلیشیر کی ۴۰ ڈگری کی ڈھلوان پر سے گذرنا پڑا۔ یہ فاصلہ تقریباً ۳۵۰ میٹر تھا اور ایسے لگتا تھا کہ شاید کئی کلومیٹر طویل ہے۔ یہ راستہ ہمیشہ ہی خراب ہوتا ہے لیکن اِس سال لینڈ سلائڈ کی وجہ سے تھوڑا سا بڑھ گیا تھا۔ اَحباب کو یہاں اچھے تلوے والے بوٹ اور مضبوط ٹریکنگ اسٹک کی اَفادیت کا بھی خوب اِحساس ہوا۔ ہمیں بار برداری کے جانور کشمنجا گاؤں سے ملنے تھے پس وہاں تک ہمیں سامان لے جانے کی ''تکلیف'' خود کرنا تھی۔ شروع کی تکلیف کے بعد ٹریک نہایت سہل ہے اور آپ نے صرف فاصلہ ہی طے کرنا ہوتا ہے۔ یہاں سے ہمارا اگلا پڑاو بروغل پوسٹ تھا۔ گدھوں پر سامان لاد کر ٹیم ممبران نے بڑی آسودگی محسوس کی۔ اِن علاقوں کے لوگ اپنی غربت کے باوجود زندگی آسانی سے گذارنے کے عادی ہیں لیکن شہری مادیت کے اَثرات بھی یہاں محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ بار برداری کے ریٹ طے ہونے پر اِس پورے خاندان کی دیدنی خوشی کا عالم سب کو گرویدہ کر گیا۔ آپ اِس سے محسوس کر سکتے ہیں کہ ٹورسٹ کی یہاں کتنی اہمیت ہے۔ کیونکہ نو ماہ کی سردی میں یہاں گھاس وسبزہ کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا۔ مقامی آبادی کا گزر اَوقات مویشیوں کے گوشت اور دودھ پر ہی ہوتا ہے۔ جولائی کے آخری ہفتہ میں بھی گندم کا بیج نہیں بن سکا تھا اور یہ خیال کیا جاتا تھا کہ سردی کی وجہ سے اِس سال فصل نہیں ہو سکے گی۔ کشمنجا گاؤں سے ہم ۱۱ بجے کے قریب بروغل پوسٹ کے لیے روانہ ہوئے۔ راستہ میں گرم چشمہ کے گلیشیر کو کراس کرتے ہی دو راستے ایک دوسرے سے جدا ہوتے ہیں۔ جنوب کا راستہ دو سے تین دن کی مسافت پر آپ کو گلگت لے جاتا ہے اور شمال مشرق کی طرف آپ بروغل پوسٹ جاتے ہیں۔ یہ ۳۵ کلومیٹر کی مسافت ہم نے سات گھنٹوں میں طے کی اور اِس دوران ہماری سمندر سے بلندی ۹۸۰۰ فٹ یا تین ہزار میٹر بمقام یارخون لشت سے ۱۰۸۰۰ فٹ

یا ۳۳۰۰ میٹر تک ہوگئی۔ اِن ٹریکس پر چلنے کے لیے آپ نے ،جیسا کہ تمہید میں تذکرہ کیا گیا ہے، اَپنی طبیعت کے مطابق چلنا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ آپ تیز چلنے میں اَپنے آپ کو آرام دہ محسوس کریں تو اِس طرح چلیئے اور اگر آپ آرام سے چلنے میں آسودہ ہیں تو آپ کسی دَوڑ میں پڑنے کی بجائے آرام سے سفر طے کریں کیونکہ اِن پہاڑوں میں کوئی میراتھن تو ہے نہیں کہ آپ کو تمغہ مل جائے گا۔ عمومی طور پر ایک اِنسان تقریباً ۵ کلومیٹر فی گھنٹہ کے حساب سے سفر کرسکتا ہے اور سست یا تیز رو اشخاص کے درمیان ایک پڑاؤ تک پہنچنے کے وقت کا فرق ۱۵ سے ۲۰ منٹ سے زیادہ نہیں ہوتا۔ تو جناب ہم خوش اسلوبی سے بروغل پوسٹ تقریباً شام سات بجے پہنچ گئے۔ ہمارا قیام ایک مٹی و پتھر کے بنے ہوئے کمرہ میں تھا جو کہ اِس تھکاوٹ سے پُرسفر کے بعد فائیوسٹار ہوٹل کے سُوٹ سے زیادہ آرام دہ محسوس ہوا گرچہ اس کی کپڑے کی فالس سیلنگ میں ہمارے ساتھ کچھ اور مکین یعنی کہ چوہے وغیرہ بھی تھے اور اِنہیں ہماری موجودگی کوئی اتنی پسند نہیں رہی تھی اور وہ پریشانی کے عالم میں چھت پر ایک جگہ سے دوسری جگہ دوڑنے کی وجہ سے اپنی ناراضگی کا اِحساس دِلا رہے تھے لیکن تھکن کا کیا جائے جو اِن چیزوں سے بے سروکار رہے۔ تھکاوٹ کی وجہ سے تمام ممبران یہ تو بھول ہی گئے کہ رات کا کھانا بھی تناول ''فرمانا'' ہوتا ہے اور فوراً ہی سو گئے۔ اِس سات سے آٹھ گھنٹوں کی مسافت میں پانی، جوس، زیادہ توانائی والے بسکٹ اور خاص طور پر چاکلیٹ بہت ہی اہم ہیں کیونکہ آپ کو فوری توانائی کی ضرورت ہوتی ہے جو کہ چاکلیٹ بڑے اَحسن طریق سے مہیا کرتا ہے۔ پانی کا تھوڑی مقدار اور بڑے وقفوں میں لینا بہتر رہتا ہے۔

صبح تقریباً پانچ بجے کمرہ سے باہر نکلنے پر غلیات پیک Ghaliat Peak کا سحر انگیز نظارہ دعوتِ فوٹوگرافی دے رہا تھا اور دوسری اونچی چوٹیوں کی طرح یہ بھی دِن کے وقت بادلوں میں لپٹی رہتی ہے۔ فوٹوگرافی کا اگر آپ کو شوق ہے تو سحر خیز ہونا ہوگا کیونکہ دِن کے وقت درجہ حرارت بڑھنے کی وجہ سے عمل تکاثف Condensation عموماً اِن چوٹیوں کو بادلوں میں چھپا کے رکھتا ہے۔ چند تصاویر اُتارنے کے بعد اَحباب کو بھوک نے ستانا شروع کیا کیونکہ رات کو تھکاوٹ کی وجہ سے راستے کے راشن پر ہی گزارا تھا ہاں البتہ ہمارے ساتھی عمار آصف نے اللہ تعالیٰ کی ''خوشنودی'' حاصل کرنے کے لیے صرف پانی کے ساتھ ہی روزہ رکھ لیا تھا کیونکہ ہمارا یہ دِن آرام کا تھا۔ پس فیض اللہ خان نے ہمارے لیے جام، چکن سپریڈ اور چائے سے پیٹ کے دوزخ کو بھرنے میں مدد کی۔ چند گھنٹوں بعد بی ایم پی کے سپاہی، جن کی پوسٹ ہماری رہائش کے ساتھ ہی تھی، ہمارے پاس

غلیات پیک

بارڈر پوسٹ بروغل

ایک خوبصورت برف پوش چوٹی

بروغل پوسٹ!

اپنی لاگ بک کے ساتھ تشریف لائے اور ہم سب کے شناختی کارڈ نمبر نوٹ کرنے کے علاوہ حال اَحوال وتعارف بھی ہوا۔محترم صوبیدار حکیم جان صاحب، جو کہ بروغل پوسٹ کے کمان دار ہیں، سے ہماری پہلے سے ہی شناسائی تھی، کا تذکرہ ہوا اور ہم نے اِن کے بارے میں اِستفسار کیا تو معلوم ہوا کہ وہ ابھی تشریف نہیں لائے۔ایک دو گھنٹوں کے وقفہ کے بعد وہ بھی تشریف لے آئے اور اِن سے ہمیشہ کی طرح بہت ہی اچھی گفتگو رہی۔حکیم جان صاحب ایک پڑھے لکھے اور زیرک شخصیت کے حامل ہیں اور علم کے ساتھ ساتھ بہت گہری تجزیاتی نظر، جس کا دائرہ کار سیاست، معیشت، مذہب وسماج پر محیط ہے، بھی رکھتے ہیں۔اِس دور اُفتادہ علاقہ میں اِس قسم کا وصف ہر کسی کا خاصہ نہیں۔اِن کی تشریف آوری کے دوران ہی کمانڈر چترال۔٦ جناب صوبیدار محمد اکرم جو کہ اپنی ذمہ داریاں وہیں پر ہی سرانجام دے رہے تھے بھی تشریف لے آئے اور اِن سے بھی اچھا حال اَحوال رہا۔یہ ملاقاتیں ایک دوسرے سے آشنائی کے ساتھ ساتھ اِن حضرات کی ''ذمہ داریوں'' میں بھی شامل ہیں تاکہ اُنہیں آگاہی ہو کہ اِس سرحدی علاقہ میں کون، کیوں اور کہاں سے اِن کا ''مہمان'' ہے۔تو جناب اِسی طرح ہمارا دن اچھے انداز سے گذر گیا اور اَحباب نے تھکاوٹ کو خوب اُتارا۔سہ پہر کے بعد جمعہ بیگ جن کے ''کمرہ'' میں ہم رہائش پذیر تھے تشریف لائے۔اور ہم سے صبح کے پروگرام کے بارے میں اِستفسار کیا۔یہ صاحب ہمارے ایک ساتھی کے لیے ایک عدد گھوڑا اور سامان کے لیے دو عدد گدھوں کے ساتھ نئے ٹرانسپورٹر تھے۔بروغل پوسٹ سے اگلے پڑاؤ لشکر گاز تک گھوڑے کا کرایہ ایک ہزار اور گدھوں کا فی ''کس'' (گدھا) آٹھ سو رُوپے طے ہوا۔ہماری رہائش کا کرایہ مبلغ ایک ہزار روپے ادا کیا گیا جو کہ دو راتوں یعنی کہ مورخہ ۲۲ جولائی اور ۲۳ جولائی کا تھا۔مغرب کے وقت عزیزی فیض اللہ خان نے جناب عمار آصف اور ہم سب کے لیے لذیذ کھانا جو کہ پکی پکائی ایلومینیم فوائل میں لپٹی ہوئی تیار شدہ بھاجی، چکن سپریڈ و جام کے ساتھ ڈبل روٹی اور چائے و گرین ٹی پہ مشتمل تھا بطور اَفطاری و ڈِنر بڑی چاہت کے ساتھ تیار کیا اور سب نے مزے سے اِس دعوت شیراز سے لطف حاصل کیا۔مغرب کے بعد ہم سب (City Dwellers) شہری زندگی کے حامل گھپ اندھیرے میں آسمان کی ''رعنائیوں'' کو دیکھ کر انگشت بدنداں رہ گئے۔ہمارے ٹیم ممبران میں عزیزی عبید اللہ خان و فیض اللہ خان فلکیات پہ کافی دسترس ہونے کی وجہ سے ہمارے لیے باعثِ علم ثابت ہوئے۔دُب اکبر (Ursa Major) سے قطب ستارہ (North Star) کو ڈھونڈ کر اَپنی سمت کا تعین کرنا ہو اور دُب اصغر (Ursa Minor) یا اَہرام (Pyramid) اور اِن کی اَفادیت اور اِنسانی

تاریخ میں اِن اَہرام کو دیکھ کر اَہرام مصر کی تعمیر ہم سب کے لیے معلومات تھیں۔ دُب اکبر کے سات نام مسلمان فلک شناسوں کے رکھے ہوئے ہیں اور یہ آج بھی اِنہی ناموں سے یاد کیے جاتے ہیں۔ جیسے کہ القعد، میزر، ایلود، میگریز، دُبہ، میراک اور فیقدا۔ اَفسوس صد اَفسوس کہ مسلمان اَب صرف پدرم سلطان بود کے مصداق ہیں اور علم کو مذہب کی ''زنجیر'' سے مقید ہوئے کئی صدیوں پہ محیط عرصہ ہو چلا۔ تنقید پہ بندش اور اِنسانوں کو مقدس قرار دینے کے رُجحان نے مذہب کے قدرتی اِرتقاء کو روک دیا ہے۔ اِس وجہ سے محمد ﷺ کے دین میں ایسا بگاڑ آیا ہے کہ اِسلام صدیوں سے ایک عمومی سا مذہب بن گیا ہے اور نتیجتاً ہر قسم کی اخلاقی بیماریاں آج ہمارا مقدر ہیں۔ مثال کے طور پر ''موعذتین'' یعنی کہ سورۃ الفلک وسورۃ الناس، کو ہم غیر مرئی طاقتوں کے حوالے سے ''سمجھنے'' پہ مصر ہیں جب کہ اِن کا تعلق خالصتاً معاشرتی برائیوں اور اِن کے تدارک سے ہے اور کسی قسم کی ''جن'' مخلوق سے نہیں ہے۔ عربی زبان میں ''جن'' سے مراد ''مخفی'' ہونا ہے یعنی کہ اِنسان، چرند و پرند، حشرات وخلیائی مخلوقات جو کہ حس اِنسان سے اگر مخفی ہیں تو اِس کے لیے ''جن'' کا درجہ رکھتی ہیں۔ ''موعذتین'' میں تو خاص الخاص توجہ حضرتِ اِنسان اور اِس کی نفسانی خواہشوں کی بنیاد پر وجود میں آنے والی اِخلاقی علتوں کے ظہور اور اور اِن سے پناہ کی پروردگار سے درخواست کی گئی ہے کیونکہ ایک اِنسان دوسرے اِنسان کے دل میں جھانک نہیں سکتا اور اِس کی مخفی سوچ کا وہ اِدراک نہیں کر پاتا۔ Milky way اور Cluster of Stars نے تو ہم سب کو حیران ہی کر دیا اور ہماری تصحیح کی گئی جب ہم اِنہیں بادل سمجھ رہے تھے جو کہ ستاروں کی ''ہماری زمین'' کے آسمان سے inter stellar light کا ایک خوبصورت نظارہ تھا۔ اِسی بحث وتمحیص میں رات کا کچھ حصہ صرف ہوا اور یہ طے پایا کہ ہم اپنے کیمپ بھی چیک کریں کیونکہ ابھی تک اِنہیں استعمال نہیں کیا گیا تھا۔ پس ہم میں سے دو حضرات نے فیصلہ کیا کہ وہ کیمپ میں سلیپنگ بیگ کے ساتھ رات گزاریں گے۔ خنکی قابل برداشت تھی اس لیے گرم چادر کا تکلف نہ کیا گیا۔ اور صرف سلیپنگ بیگ میں گھس گئے۔ رات کے آغاز میں تو cozyness تھی لیکن پچھلے پہروں میں خنکی ٹھنڈک میں تبدیل ہوگئی اور سلیپنگ بیگ ہمارے لیے کوئی اچھے ساتھی ثابت نہ ہونے لگے اور دور ُوحیں نیند سے آزاد و غافل ہو کر ایک دوسرے سے باتیں کرنے میں لگ گئیں اور اَپنے آپ کو مساج کر کے گرم کرنا سعی لاحاصل بن گیا۔ اِس تجربے سے یہ علم ہوا کہ اپنی حفاظت کا مکمل بندوبست ہونا ایسے سفر میں نہایت اہم ہے۔

بروغل سے شوار شیر تک

مورخہ ۲۴ جولائی صبح ساڑھے چھ بجے ہم سب ناشتہ، جو کہ ڈبل روٹی و جام و چکن سپریڈ و چائے پہ مشتمل تھا، سے فراغت کے بعد سامان اکٹھا کرنے اور تیاری میں مشغول تھے کہ جمعہ بیگ اپنی ''ٹرانسپورٹ'' (ایک گھوڑا اور دو عدد گدھے) کے ساتھ تشریف لے آئے۔ بروغل پوسٹ، اِشکروارز سے لشکر گاز کے لیے ہمارا آٹھ بجے کوچ ہوا۔ ایک دن پہلے ہی جمعہ بیگ کے ساتھ باہم مشاورت سے فیصلہ کر لیا گیا تھا کہ ہم عمومی پڑاؤ جو کہ لشکر گاز تھا، نہیں رکیں گے بلکہ اِس سے اگلا پڑاؤ جو کہ شوار شیر تھا، میں قیام کریں گے۔ تا کہ آئندہ سفر سہل ہو سکے اور ہم ویسے بھی ایک دن آرام کی غرض سے بروغل پوسٹ پہ تھکاوٹ اُتار چکے تھے۔ یہ سفر ایک سبز چراگاہ (اِشکروارز) سے گذرنے کا تھا جو کہ اُونچی نیچی پگڈنڈیوں جو کہ بعض جگہوں پر چار سو سے آٹھ سو فٹ بلندیوں پر مشتمل تھا۔ لیکن آپ ایسے سفر کو کسی صورت مشکل نہیں کہہ سکتے۔ راستہ میں آپ بالکل تنگ پتھریلی پگڈنڈی پر تقریباً دو کلومیٹر دریا کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں اور اِس راستہ پر ایک وقت میں صرف ایک ہی شخص چل سکتا ہے اور باقی چیونٹیوں کے نظم و ضبط کے ساتھ ایک قطار میں ایک دوسرے کے پیچھے چلتے ہیں۔ ایسے لمبے سفر میں اُکتاہٹ ہونا بھی فطرتی امر ہے جسے آپ آپس میں بات چیت اور راستہ کی عکس بندی یا فوٹوگرافی سے دُور کر سکتے ہیں۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے کی مسافت کے بعد ہم بروغل پاس (مقامی افراد اِسے ''دروازہ'' کہتے ہیں) کے دائیں سے ہوتے ہوئے گذرے کہ ہمارا رُخ شمال مشرق سے تھوڑا جنوب مشرق کی طرف ہو گیا۔ بروغل پاس یا درۂ بروغل پاکستان کے بالکل شمال میں افغانستان سے متصل ہے اور یہی نو میل یا پندرہ کلومیٹر لمبی پٹی واخان کوریڈور Wakhan Corridor کہلاتی ہے اور اِس کی چوڑائی چار میل یا ساڑھے چھ کلومیٹر ہے اور شمالاً افغانستان کو تاجکستان سے ملاتی ہے۔ اِس درۂ کے علاوہ بہت سے پیدل راستے بھی ہیں جنہیں مقامی افراد اپنی آمد و رفت کے لیے

لشکر گاز کا منظر

لشکر گاز میں!

شوار شیر میں خیمہ زن

لشکر گاز سے شوار شیر جاتے ہوئے

استعمال کرتے ہیں۔ ''گارہل'' ایک چھوٹی سی بستی سے ہوتے ہوئے اور وہاں کے مقامی افراد کے ساتھ تصاویر بنانے کے بعد ہم تقریباً ساڑھے بارہ بجے کے قریب لشکر گاز پہنچے۔ یہ، اِس پورے علاقہ کی طرح، چند گھروں پہ مشتمل آبادی ہے اور یہاں بروغل پوسٹ کے کمان دار حکیم جان کے برادر خورد سے ملاقات ہوئی جو کہ ایک اسکول میں ملازم تھے اور اپنے علاقہ میں علم پھیلانے پر گامزن ہیں۔ لشکر گاز نہایت سرسبز ہے اور یہاں لکڑیوں کے بالے لگا کر ایک اِحاطہ بطور کیمپنگ سائٹ بھی بنایا گیا ہے اور اِس کے اندر پی وی سی کے پینلز کے ساتھ بنا ہوا ایک طہارت خانہ بھی بنایا گیا تھا جو شاید کسی یورپین گروپ کی کارستانی محسوس ہوتی تھی کیونکہ ہم تو آزاد منش قوم ہیں جس کا اِس قسم کی ''خرافات یعنی کہ صفائی وستھرائی'' سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہاں اَحباب پینتیس سے چالیس منٹ آرام و اپنی توانائیوں کو بحال کرنے کے بعد ڈیڑھ بجے دو پہر اپنے اگلے پڑاو یعنی کہ شوار شیر کے لیے روانہ ہوئے۔

لشکر گاز سے شوار شیر کا راستہ بھی کوئی خاص مشکل نہیں سوائے اِس کے کہ پہلے سے زیادہ اونچائی اور زیادہ نشیب و فراز سے آپ کا گذر ہوتا ہے۔ اِس وقت سورج عین سر پر ہونے کی وجہ سے تھوڑی گرمی بھی محسوس ہوئی۔ اگر بادل ہوں تو سفر خوشگوار بن جاتا ہے۔ اِسی وجہ سے آپ کے پاس سوتی رومال، ہَیٹ یا شیڈ والی ٹوپی ہونا لازم ہے۔ راستہ نہایت ہی سرسبز اور پر شکوہ چوٹیوں سے پُر ہے اور اِن کے گلشیئر سفر کو دلکش بناتے ہیں۔ بروغل چونکہ دس ہزار فٹ سے بلند ہے اس لیے یہاں مارمٹ Marmota caudata (مقامی اِسے ''بشین'' کہتے ہیں) یا گولڈن مارمٹ کثرت سے آباد ہے۔ یہ ایک بڑی گلہری کی طرح کا جانور ہے جو کہ پہاڑ میں بل بنا کے اپنی کالونی بناتا ہے اور اپریل سے اگست کے اختتام تک اپنے بلوں سے باہر نکلتا ہے اور اِس دوران گھاس کھا کر خوب موٹا ہو جاتا ہے اور باقی سال کے مہینے یہ اپنے بلوں میں واپس چلا جاتا ہے۔ اِنسان کو دیکھ کر یہ ایک مخصوص چیخ سے اپنی کمیونٹی کو وارننگ سگنل دیتا ہے۔ عمومی طور پر یہ بہت ہی shy ہوتا ہے۔ اِس کی قدرتی رہائش (habitat, temperate grassland) سرد چراگاہ ہے۔ یہ افغانستان، آرمینیا، آذربائیجان، چین، ہندوستان، قازقستان، کرغیزستان، پاکستان، تاجکستان اور اُزبکستان کے بلند پہاڑی ٹھنڈے علاقے میں بکثرت پایا جاتا ہے۔ لومڑی، جنگلی کتا اور بھیڑیا اِس کو شکار کرتے ہیں۔ تو جناب ہم تقریباً چار بجے دو سرسبز پہاڑی ٹیلوں کے درمیان مسطح چراگاہ پر پہنچے۔ جمہ بیگ اور

اِس کے دو ساتھیوں نے گدھوں سے سامان اُتارنا شروع کیا اور ہمیں بتایا کہ یہ شوار شیر ہے۔ مشرق کی سمت پتھروں اور مٹی کے بنے ہوئے تین یا چار گھروں اور اِن کے ساتھ پتھروں سے بنی ہوئی چار دریواری پہ مشتمل یہ ایک قصبہ تھا جس میں پینتیس سے چالیس لوگ بشمول خواتین وحضرات و بچے رہائش پذیر تھے۔ یہاں اَحباب نے کثیر تعداد میں یاک (Yak) (جسے مقامی افراد ''خوش گائے'' کہتے ہیں) دیکھے جو قدرتی چراگاہ میں ریوڑوں کی صورت میں کثرت سے نظر آتے ہیں۔ یہ مقامی افراد کی ''مشترکہ'' ملکیت ہیں جو اِنہیں دودھ، گوشت و بار برداری کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ شمال میں ہندوکُش اور پامیر کے بلند پہاڑ اور جنوب میں بھی اِسی ہندوکُش کی چوٹیاں و گلیشیئر ہمیں مرعوب کرنے پہ تلی ہوءتھیں۔ جمعہ بیگ کو ڈیڑھ پڑاؤ یعنی کہ بروغل پوسٹ سے لشکر گاز ایک پڑاؤ اور لشکر گاز سے شوار شیر آدھا پڑاؤ کے حساب سے ادائیگی کی گئی اور وہ ہمیں نئے ساتھیوں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر واپس روانہ ہو گیا۔

ایک تھکا دینے والے سفر کے بعد، ہم سب کے لیے رہائش کا انتظام، یعنی کہ کیمپس کو اِیستادہ کرنا کسی چوٹی کو سر کرنے کی مانند معلوم ہو رہا تھا۔ موسم کے تیور بگڑنے اور مقامی آبادی کے بچوں کی موجودگی نے ہمیں اِس بات پر آمادہ کیا کہ یہ کام کر ہی لیا جائے۔ تاکہ اپنا ٹھکانہ بنا کر اپنے آپ اور سامان کو محفوظ کیا جائے۔ سب نے مل کر یہ مشکل مرحلہ سرانجام دیا اور کھانے پینے کی دوڑ دھوپ شروع کی گئی۔ عزیزی فیض اللہ خان کی سربراہی میں نوڈلز، پکے پکائے کھانے اور چائے سے سب نے پیٹ پوجا کی اور توانائی بحال ہونے پر سب کی جان میں جان آئی۔ اِس دوران آگے قصد کے لیے پروگرام بھی تشکیل دینے پہ غور و خوض کیا جانے لگا۔ مقامی افراد سے تین عدد گھوڑوں کے لیے جوڑ توڑ کی گئی جس میں سے ایک ہمارے ساتھی اور دو عدد سامان کے لیے مختص کیے گئے اور طے پایا کہ ہم صبح سویرے ناشتہ کرنے کے فوراً بعد مار گیچ کے لیے روانہ ہوں گے۔ مغرب کے وقت گھپ اندھیرا ہونے کے ساتھ ساتھ ہوا کی شدت میں بھی اضافہ ہونے لگا۔ موسم اَبر آلود تھا لیکن بھرے پیٹ اور تھکاوٹ کے ملغوبہ نے فوراً ہی مسافروں کو اپنی آغوش میں لے لیا۔ عمار آصف ،محمد عبید اللہ خان اور راقم ایک کیمپ میں تھے جو کہ سائز میں بڑا تھا جب کہ ڈاکٹر محمد عبداللہ خان اور فیض اللہ خان دوسرے کیمپ میں تھے۔ اِن کیمپوں کو اچھی طرح باندھا گیا کیونکہ ہوا نے کافی رفتار پکڑ لی تھی لیکن بڑے کیمپ کی میخیں نہ ملنے کی وجہ سے ایک دھڑکا سا ضرور تھا۔ اِس کمی کو وہاں پڑے ہوئے پتھروں سے پورا کیا گیا اور ڈوریوں سے دونوں کیمپوں کو

تھکے ہارے مسافر شوارشیر میں

شوارشیر پیک

سولر پینل سے آراستہ گھر

چراگاہ

اچھی طرح باندھ دیا گیا۔ رات کو ہوا کی رفتار کافی زیادہ ہوگئی جو کہ اندازاً ۵۰۔۶۰ کلومیٹر فی گھنٹہ تک پہنچ گئی اور ہمارے کیمپ بری طرح لڑکھرانے لگے۔ بڑے کیمپ کی چھت تو سلیپنگ بیگ میں دبکے ہوئے ہمارے منہ کو آ آ کر لگ رہی تھی اور ہمیں اندر سے اِن کے راڈز کو اونچا کرنا پڑ رہا تھا اور سونے پہ سہاگہ بارش کا شروع ہونا تھا۔ خیر جیسے تیسے رات کیا گذری ہم تین اور دو بھائی جو کہ دوسرے کیمپ تھے ایک دوسرے کے ساتھ اُونچا اُونچا بول کر دِلاسے اور ہمت بڑھاتے رہے کہ ہوا اور بارش ہمارے کیمپوں کا کچھ نہ بگاڑ سکے گی اور واقعتاً رات گذر گئی۔ علی الصبح ہم جاگ گئے اور اپنے کیمپوں سے باہر نکلے تو انتہائی خوشگوار موسم کا سامنا ہوا۔ خنکی، دُھند اور ہلکی پھوار نے رات کے واقعات کو یکسر بھلا دیا۔ اِردگرد کے چوٹیاں برف سے اَٹی ہوئی اور دُھند میں لپٹی ہوئی نظر آئیں۔ اِس نظارے کو شاید الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ ہاں ایک تلخ تجربہ سے ہمیں گذرنا پڑا کہ ہمارے کیمپ خصوصاً جس میں ہم تین لوگ، یعنی کہ راقم، عبیداللہ خان اور عمار آصف، تھے نے یہ ثابت کیا کہ وہ ایک عمومی سا ہے اور اِن پہاڑوں کی صعوبتوں کے لیے نہیں بنا کیونکہ اِس کی سلائی کی درزوں نے پانی کو نہ روکا اور قطرہ قطرہ می شود دریا کے مصداق ہمارے کیمپ میں کافی پانی جمع ہوگیا۔ بچت اِس لیے ہوگئی کہ کیمپ کو اِس طرح اِیستادہ کیا گیا تھا کہ پانی ہماری طرف کی بجائے کیمپ کے دروازے میں جمع ہوتا رہا یعنی کہ یہ ایک ڈھلوانی سطح پہ تھا۔ ہمارے سلیپنگ بیگ البتہ اچھے ثابت ہوئے اور ہم رات بھیگنے سے بچ گئے۔ لیکن ہمارے دو احباب یعنی کہ عبیداللہ خان کا سونی بریویا جو کہ مبلغ ۲۴،۰۰۰ روپے کا چند ہی ماہ پہلے خرید کیا گیا تھا اور عمار آصف کا نوکیا موبائل اِس جمع شدہ پانی میں مکمل طور پر بھیگ گئے بلکہ ڈوب گئے اور عبیداللہ خان کا Sony Bravia تو ختم ہی ہوگیا جبکہ عمار آصف نے لاہور جا کر اپنے موبائل کی ایل سی ڈی ڈلوالی اور اِس طرح تھوڑے نقصان کے متحمل ہوئے۔ خیر صبر و شکر کے ساتھ یہ نقصان برداشت کیا گیا اور ناشتہ کے بعد ڈُھنڈیا پڑی کہ اگلے ہدف یا پڑاؤ کے لیے کوچ کیا جائے۔ سامان اکٹھا کرنا اور سواریوں کا انتظام و انصرام اِس میں شامل تھا۔

شوارشیر سے مارگیچ تک

۲۵ جولائی ۲۰۱۲ء کو صبح ساڑھے دس بجے ہم سب شوارشیر سے مارگیچ کے لیے روانہ ہوئے۔ باربرداری کے لیے دو عدد گھوڑے شوارشیر سے ہمارے ساتھ تھے کیونکہ پچھلی پارٹی نے ہمیں خیرباد کہہ دیا تھا۔ اِس علاقہ میں رواج ہے کہ باربرداری یا سواری کے لیے اُسی علاقہ کے لوگوں کو جہاں آپ رہائش ہوتے ہیں ترجیح دی جاتی ہے اور ہر علاقہ کو پڑاؤ میں منقسم کیا جاتا ہے۔ اُجرت بھی اِسی حساب سے طے ہوتی ہے یعنی کہ ایک، ڈیڑھ، دو یا تین پڑاؤ۔ ایک علاقہ کے لوگ اپنی حدود سے واپس کر دیے جاتے ہیں اور اگلے علاقہ کے لوگوں کا حق اُن کے ہاں سے شروع ہوتا ہے۔ شوارشیر سے مارگیچ تک کا فاصلہ کچھ زیادہ نہیں لیکن آپ کو کم بلندی کی پہاڑیوں سے مسلسل گذرنا ہوتا ہے لیکن موسم یہاں نہایت لطف اندوز تھا کیوں کہ ہلکی ہلکی پھوار اور بادلوں کے مسلسل سائے میں ہم بغیر کسی خاص تھکاوٹ کے تقریباً پونے بجے یعنی بارہ بج کر پینتالیس منٹ پر مارگیچ پہنچ گئے۔ یہاں بھی شوارشیر کی طرح ایک ڈھلوانی سطح پر دو چھوٹی پہاڑیوں کے درمیان کیمپ لگائے گئے۔ موسم کے تیور کچھ اتنے اچھے نہیں تھے اس لیے کیمپ لگانے میں نہایت اِحتیاط کی گئی تا کہ پچھلی رات والی کیفیت کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ سامان میں سے میخیں بھی ڈھونڈ لی گئیں اور اُنہیں نہایت اَحسن طریقہ سے قائم کر دیا گیا۔ جس کا یہ ثمر ملا کہ کیمپ موسمی تغیرات سے نمٹنے کے لیے بالکل تیار تھے لیکن موبائل فونوں کا نقصان تو ہو چکا تھا۔ یہاں پتھروں اور گارے سے لیپے ہوئے گھروں پہ مشتمل پینتیس سے چالیس نفوس آباد تھے۔ ہماری رہائش اِن سے کئی سو گز کے فاصلہ پر تھی۔ نزدیک ہی پہاڑی ندی کی صورت ہمارے غسل وطہارت خانے کا اہتمام بھی تھا۔ وہاں جا کر مائع صابن اور شیمپو کرنے سے ہم نے تسکین محسوس کی اور عمار آصف نے تو ایک سو روپے کے عوض آبادی سے گرم پانی کی کیتلی سے غسل ''شریف'' بھی فرما لیا۔ ہمارے مشرق میں کرومبر، مغرب میں بروغل، جنوب میں ہندوکش اور قراقرم کا سنگم اور

مارگیچ کی صبح

مارگیچ میں ایک چوٹی

یاک کا غول

مارگیچ سے شوئنج کی تیاری

شمال میں افغانستان وتاجکستان کے پامیر کا سلسلہ تھا۔ مارگیچ قدرے اونچائی پر ہے لیکن موسم نہایت شاندار تھا اور ہلکی پھوار شام ڈھلتے ہی درجہ حرارت کم ہونے کی وجہ سے برفیلی سی محسوس ہونے لگی۔ کیمپ کے اندر کا ماحول کافی بہتر تھا کیونکہ یہ انسانی گرمائش کو باہر نہیں جانے دیتے اور اِس طرح آپ کے لیے کافی آرام دہ بن جاتے ہیں۔ رات ہوتے ہی یہاں بھی ہوا نے کافی رفتار پکڑ لی اور بارش بھی کافی تیز ہوگئی لیکن ہماری احتیاط اور تجربے کا خاطر خواہ فائدہ ہوا اور کوئی خاص پریشانی نہیں ہوئی۔ ساری رات بارش ہوتی رہی اور ہم اپنے کیمپوں میں آرام سے سوئے رہے۔ بارش اور کہر سے لپٹی ہوئی صبح ایک اِنتہائی خوشگوار موسم کا پیام لے کر آئی۔ پچھلے دِن جو پہاڑ اپنی بلندی کا رُعب جمارہے تھے اَب دُھند میں اپنی کوتاہ قامتی کا پرتو تھے۔ اِس دوران ایک عجیب واقعہ رونما ہوا۔ راقم کیا دیکھتا ہے کہ ایک بچھڑی ہمارے کیمپ کے بالکل ساتھ گھاس چرنے میں مگن ہے۔ کہ ایک بیل جو کہ گلّے کا سردار تھا اُس کے پاس آ گیا اور اُس کے آگے پیچھے جنسی اُکساؤ کرنے لگا۔ میں نے عمار آصف کو خاموشی سے بتایا اور ہم یہ تماشہ تقریباً بیس سے پچیس منٹ دیکھتے رہے۔ بیل نے خوب کوشش کی لیکن بچھڑی چوں کہ بلوغت کی عمر میں ابھی قدم رکھ رہی تھی کی طرف سے جواب ندارد۔ آخر کار وہ تھک کر دوسری طرف نکل گیا اور میں سوچنے لگا کہ ہم اِنسانوں سے تو یہ جانور بہتر تھے! خنکی اور بارش جو کہ کبھی تو ہلکی اور کبھی تیز ہو جاتی تھی ہمارے پلان کو ڈانوا ڈول کر رہی تھی کہ یک دم دو اشخاص پہاڑیوں سے، جو کہ ہمارے مغرب میں تھیں، نمودار ہوئے۔ اِن میں سے ایک جناب محمد اسلم جان برادر خورد حکیم جان کمان دار بروغل پوسٹ تھے جبکہ دوسرے گل نذر خان تھے۔ محمد اسلم خان لشکر گاز میں رہائش پذیر تھے اور وہیں وہ ایک اسکول کے منتظم ہیں اور اپنے علاقہ میں علم کی روشنی پھیلانے میں پیش پیش ہیں۔ وہ اپنے بھائی کی طرح نہایت خوش اخلاق اور شفیق تھے۔ گل نذر خان اِن کے برادرِ نسبتی تھے۔ انہوں نے آتے ہی فرمایا کہ موسم نہایت شاندار اور بارش زیادہ نہیں ہے پس رختِ سفر باندھ کر کوچ کی تیاری کی جائے۔ گل نذر خان کے بارے میں اُنہوں نے بتایا کہ یہ ہمارے گائیڈ اور رہنما کے فرائض سرانجام دیتے رہیں گے جب تک ہم گاڑی کی سہولت تک نہ پہنچ جائیں۔ اِسی دوران وہ ہمارے کیمپ کے متصل آبادی میں گئے اور ہمارے لیے چار گھوڑے اور ایک یاک کا انتظام کر کے واپس آئے جس کے کرایہ کے بارے میں بات چیت پچھلے دن لے دے کر کے کر لی گئی تھی۔ یاک ہمارے سامان کے لیے مختص تھا کہ یہ جانور دو گھوڑوں کا سامان اپنے اوپر لاد سکتا ہے اور اِسی مناسبت سے اِس کی اُجرت طے کی جاتی ہے۔

مارگیچ سے شوئنج تک

مورخہ ۲۶ جولائی ۲۰۱۲ء صبح نو بج کر پندرہ منٹ پر ہم رخت سفر باندھ کر اپنے اگلے پڑاؤ شوئنج کے لیے روانہ ہوئے۔ جیسے ہی ''آبادی'' سے ہمارا قافلہ نکلا تو بارش بھی تھوڑی سی تھم گئی اور منظر نہایت سہانا ہوگیا کہ ایک چھوٹی سی وادی میں ایک بہت بڑا غول جانوروں کا نظر آیا۔ یہ غول یاک کا تھا اور اِتنی بڑی تعداد میں اِن کا اکٹھے پھرنا ایک حیرت ناک منظر تھا۔ یہ جانور ہمیشہ بلندی اور درجہ حرارت ۱۲ ڈگری سینٹی گریڈ سے کم میں رہنا پسند کرتا ہے اور اپنے جثہ کے لحاظ سے کافی لحیم شحیم ہوتا ہے۔ اِس کی موٹی کھال اور لمبے گھنے بال یا فر fur اُس ماحول میں اُس کے لیے قدرت کی طرف سے مددگار ہیں لیکن یہ جانور aggressive بالکل نہیں ہے اور پنجاب کی گائے جیسی طبیعت رکھتا ہے۔ اِن (یاک) کی آبادی اُس آبادی کی ملکیت ہے جہاں یہ موجود ہوتے ہیں یعنی کہ یہ مشترکہ ملکیت میں شمار کیے جاتے ہیں۔ جناب گل نذر خان کی خصوصی خواہش و ہدایت پر اِس منظر کی عکاسی اور تصویر کشی کی گئی۔ سفر نہایت سہل لیکن لمبا تھا۔ اِس دوران بارش بھی اپنا رنگ جماتی رہی اور احباب نے اِس سے بچنے کا خاطر خواہ انتظام سیلوفین سے بنی ہوئی برساتیوں سے کیا ہوا تھا۔ تقریباً دو گھنٹے کی مسافت کے بعد یعنی کہ سوا گیارہ بجے ہم کرومبر جھیل پہنچے۔ یہ تازہ پانی کی جھیل چودہ ہزار فٹ کی بلندی پر ہے اور پاکستان کی چند بڑی اور دُنیا میں اِنتہائی بلندی پہ واقع تازہ پانی کی جھیلوں میں شمار کی جاتی ہے۔ جھیل سے پہلے دو بڑے پتھر اُونچائی پر ایستادہ کر کے حد بندی کی گئی ہے یعنی کہ جھیل والا علاقہ (مشرق) گلگت۔ بلتستان میں شمار کیا جاتا ہے جب کہ اِس سے مغرب والا علاقہ چترال یعنی کہ خیبر پختون خواہ میں آتا ہے۔ کرومبر جھیل تقریباً ساڑھے تین میل لمبی اور سوا میل چوڑی ہے۔ اِس کا قطر تقریباً ساڑھے سات میل ہے۔ پانی انتہائی صاف ہے جو کہ اردگرد کی پہاڑیوں سے برف پگھلنے کے بعد اِس میں آتا ہے۔ اِس کی گہرائی کا ہمیں علم نہ ہوسکا۔ کرومبر لیک پر بارش

جو ہمارے ساتھ ساتھ تھی نے ہلکی برف باری کا رنگ اختیار کرلیا۔ کیونکہ کرومبر جھیل اِس پورے ٹریک میں سب سے زیادہ اُونچائی پر ہے اِس لیے اَب ہماری اُترائی شروع ہو گئی۔ اور اِس کے ساتھ ساتھ بارش بھی تیز سے تیز تر ہوتی گئی۔ یہاں بھی سفر کوئی زیادہ دشوار گزار نہیں لیکن لمبا تھا۔ سفر کی طوالت نے ہم پہ اپنے اثرات ظاہر کرنے شروع کر دیے اور ہم سب کی خواہش تھی کہ جلد از جلد منزلِ مقصود پر پہنچا جائے۔ اپنے منزل مقصود پہنچنے سے پہلے دو گھڑ سوار خواتین ایک پیادہ نوجوان کے ساتھ سرد بارش میں بروغل کی طرف جاتے نظر آئے۔ اُدھیڑ عمر خاتون بنے ٹھنے انداز میں ملبوس تھیں جو کہ کیلاش خواتین کے لباس سے مماثلت رکھتا تھا جب کہ نوجوان خاتون مقابلتاً سادہ لباس میں تھیں۔ گل نذر خان نے اُن سے خوار زبان میں حال اَحوال کیا۔ اِس حال اَحوال میں بزرگ خاتون کے ہاتھ کو چومنا اِس علاقہ کی روایت ہے۔ بعد میں جب ہم پیاخین سے مترم داس بورتھ کے لیے نکلے تو علی جو اُن بزرگ خاتون کے فرزند تھے نے بتایا کہ اُن کی اماں اور بہن کماندار بروغل حکیم جان کے ہاں اُن کی نسبت طے کرنے جا رہی تھیں۔ گل نذر خان، جو کہ گنج آباد کے رہائشی تھے، سے میں نے پوچھا کہ اُن کی برات میں کتنے لوگ تھے اور کس راہ کو اختیار کیا گیا تھا تو اُنھوں نے بتایا کہ دس سے گیارہ لوگوں کا قافلہ دُلہن کو لینے بروغل اِسی دشوار گزار راستہ سے ہی گیا تھا کیوں کہ اِس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں۔ سفر کی طوالت اور مسلسل بارش نے نہایت تھکا دیا۔ راقم اور گل نذر خان با پیادہ تھے اور ایک دوسرے کو تسلیاں دیتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ جب کہ ہمارے وہ ساتھی جو گھوڑوں پہ سوار تھے گھڑ سواری سے اُکتائے ہوئے تھے لیکن اپنے مہاروں کے ساتھ جلد اپنی منزلِ مقصود یعنی کہ شوئنج پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ اِن کے تقریباً پندرہ سے بیس منٹ کے بعد ہم دونوں بھی تقریباً چار بجے سہ پہر پہنچ گئے۔ ہمارے پیدل چلنے اور مسلسل بارش میں سفر نے ہم دونوں کے لیے سفر بہتر و خوشگوار کر دیا تھا لیکن گھڑ سوار اپنی حرکات محدود ہونے کی وجہ سے hypothermia کا شکار ہو گئے تھے۔ یہاں ایک جانوروں یعنی کہ مویشیوں کے لیے بنائے جانے والے ''کمرہ'' میں ہم نے فوری پناہ لی۔ مقامی افراد، جو کہ ہمارے گھوڑوں کے ساتھ تھے، نے فوراً ہی لکڑیاں اکٹھی کر کے آگ جلائی اور وہ سب اِس کے اِردگرد مجتمع ہو کر بیٹھ گئے جب کہ مسافر اجنبی! یعنی کہ ہمیں ٹھینگا دیکھا دیا گیا۔ کچھ دیر تو ہم نے برداشت کیا لیکن کب تک فوراً ہی ڈانٹ ڈپٹ کی اور اِن سے کہا کہ تم لوگ تو مقامی ہو اِس لیے ایسے موسم کے عادی ہو لیکن ہم اِس موسم کے عادی نہیں اِس لیے ہمارا حق اُن سے زیادہ ہے۔ فوراً ہی اُن کی طرف سے ڈیمانڈ آئی کہ ہمیں رقوم دے دی جائیں تا کہ وہ واپس روانہ ہوں اور ہم

نے فوراً ہی اُن کا حساب کیا اور اُنھیں حقیقتاً نکال دیا اور گل نذر خان کی معیت میں اور لکڑیاں اکٹھی کر کے آگ کے آلاؤ کے اِرد گرد بیٹھ کر ہم سب اپنے حواس اور جسمانی درجہ حرارت کو درست کرنے کی سعی کرنے لگے۔ کھانے پینے اور اس کے لیے انتظام کرنے کا کسے ہوش تھا۔ اور کوئی بھی اِس کے لیے جسمانی اور ذہنی طور پر تیار نہ تھا۔ خیر بھلا ہو فیض اللہ خان کا اُنہوں نے ہمت کی اور ہم سب کی چائے، کافی، چاکلیٹ اور بسکٹ کے ساتھ تواضع کی۔ ہمارے پاس آخری 7up کی بوتل موجود تھی جو ڈاکٹر صاحب نے کھول لی۔ اِس کی carbonization ایسی تھی جیسے کہ ڈیپ فریزر میں رکھی گئی ہو۔ اِس سے ٹھنڈے موسم کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ہم سب نے سردی میں اِس سے خوب لطف لیا۔ پیٹ میں کچھ جانے سے سردی سے افاقہ ہوا۔ ہمارا ''کمرہ'' جو کہ دراصل جانوروں کا تھا، میں شام ہوتے ہی اِس کے باسی جو کہ بکریوں، گائے وغیرہ پہ مشتمل تھے، نے آنا شروع کر دیا لیکن دخول کے راستہ پہ بیٹھے ہوئے ہم سب نے چوکیداری کرنا شروع کی اور اِنہیں (یعنی کہ گائے اور بکریوں کو) راستہ دکھایا کہ آج کی رات ہم یہاں مہمان ہیں اور انہیں چاہیے کہ اپنا کوئی دوسرا انتظام کریں۔ بچارے جانور ہماری حالت پہ ترس کھا کر اور ایک خاموش نگاہِ غلط ڈال کر آگے بڑھ جاتے۔ ایک ترپال کو بچھا کر اپنے سلیپنگ بیگ اِیستادہ کر لیے گئے اور اِس طرح ہمارا ''شاندار'' کمرہ تیار ہو گیا گرچہ ہم میں سے کچھ احباب جانوروں کی بدبو پر ضرور پریشان تھے لیکن باہر بارش اور سردی میں یہ ''کمرہ'' ایک خوبصورت ٹھکانہ محسوس ہوا۔ ڈاکٹر عبداللہ خان کے مطابق جب وہ شوئنج پہنچے تو سردی اور تھکن سے بہت تھک چکے تھے اور اِس کمرہ پر نظر پڑتے ہی اُنہوں نے اِس میں داخل ہونے کا جب اظہار کیا تو اِن کے ساتھ مقامی لوگوں نے ہچکچاہٹ کا اِظہار کیا اور انہیں بتایا کہ یہ تو جانوروں کی آماجگاہ ہے لیکن اُنہوں نے خود ہی کمرہ کے دروازہ سے پتھر ہٹا کر اپنے لیے ''چھت'' کا انتظام کیا۔ ڈاکٹر صاحب کی ہدایت تھی کہ جب آپ گیلے ہوں اور سخت سردی بھی ہو تو پہلے پہل اپنے گیلے کپڑوں سے چھٹکارا پائیں اور خشک پوشاک لے کر اپنے آپ کو گرم کریں۔ شوئنج، پاکستان کے انتہائی شمال کا علاقہ ہے اور واخان کی پٹی کے انتہائی قریب ہے۔ صرف ایک سے ڈیڑھ گھنٹے کی پیدل مسافت پر آپ نہایت آسانی کے ساتھ واخان جاسکتے ہیں۔ شوئنج کا پورا گاؤں زمین نہیں بلکہ ڈھلوانوں پر مشتمل ہے اور علاقہ کافی سرد ہے۔ شمال میں پامیر کا سلسلہ آپ کو خوبصورت نظارہ کی دعوت دیتا ہے جبکہ جنوب میں دریا کے اُس پار قرا قرم اپنی چوٹیوں کے ساتھ اِیستادہ ہے جبکہ شوئنج کا گاؤں کوہ ہندوکش میں واقع ہے۔ گاؤں میں آبادی کا تناسب اِس پورے علاقہ کی طرز پر یعنی کہ چند سو نفوس پہ

مشتمل ہے۔ یہاں زیادہ آبادی گجر قبیلہ پر مشتمل ہے جو کہ مذہباً سنی مسلک سے تعلق رکھتے ہیں جبکہ اِس پورے علاقہ میں شیعہ مسلک کے اسماعیلیوں کی اکثریت ہے۔ کبھی کبھار فروعی اختلافات بھی ہو جاتے ہیں لیکن یہ اتنے عام نہیں۔ گجر چونکہ اقلیت میں ہیں اِس لیے اِن میں اِحساس تحفظ واضح طور پر محسوس کیا جا سکتا تھا۔ لوگوں کی بودو باش بھیڑ بکریوں پر ہے اور اَمارت کا معیار بھی یہی ہے۔ شادی کرنے کے لیے دلہن والوں کو اُن کے تقاضا کے مطابق بکریاں دی جاتی ہیں۔ یہاں جس خاندان میں بچیوں کی کثرت ہو اِس کو مستحسن خیال کیا جاتا ہے۔ ہم سب اپنے حواس کو درست کرنے کے بعد کھانے کے بارے میں سوچنے لگے۔ اردگرد دوڑتی بھاگتی بکریاں اور اِن کی اٹھکیلیوں پر ہماری سب کی بُری نظر تھی۔ پس اِس بات پہ سب متفق ہو گئے کہ ایک عدد بکری کی جان اپنے منہ کے ذائقہ اور پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے لی جائے۔ ہمارے کمرہ کے مالک جناب محمد صاحب کو بلا لیا گیا جو کہ اِس علاقہ میں ایک معروف شخصیت تھے کیونکہ وہ آخر کار سب سے بڑے ''بکریوں'' کے ریوڑ کے مالک تھے اور ایک سے زیادہ ''مکانات'' کے مالک اور خاندان کے بزرگ ہونے کے ساتھ راسخ العقیدہ سُنی مسلمان بھی تھے۔ پاکستان کے بہت سے علاقے تبلیغی خدمت کی وجہ سے دیکھ چکے تھے۔ اُن سے مبلغ ۲۵۰۰ روپے میں جانور کی بنوائی و پکائی طے ہوئی۔ اُنہوں نے فرمایا کہ بکری صرف نمک میں پکائی جائے گی۔ مغرب کے بعد وہ بڑی بڑی بوٹیوں سے بھرا ہوا دیگچہ لے آئے اور ہمارے سامنے رکھ دیا گیا۔ چھوٹی عمر کی بکری پہاڑی انداز سے پکائی گئی تھی جس کے ہم سب کچھ اتنے عادی نہیں تھے۔ لیکن کیا کیا جائے اب تو انڈا اسے چوزہ نکل چکا تھا اور ہم نے ''مزے'' لے لے کر اِس پہ طبع آزمائی کی اور اپنے دانتوں کا بھی خوب امتحان لیا۔ ہمارے میزبان موصوف کا اِسرار تھا کہ ہم بوٹیوں کو اچھی طرح صاف نہیں کر رہے حالانکہ اِدھر تو داڑھوں میں بوٹیاں نوچ نوچ کر کافی تکلیف و درد کی کیفیت تھی۔ خیر اِس ''لذیذ'' کھانے سے ہماری جسمانی پروٹین کی ضرورت پوری ہوئی اور جسم دن بھر کی تھکان سے آزاد ہو کر آرام کرنے کا عندیہ دینے لگا۔ ایک مرتبہ پھر فیض اللہ خان نے تکلیف کی اور ہمارے لیے کافی بنائی جس سے کافی لطف حاصل ہوا۔ اِس دوران کافی لکڑیاں جمع کر لی گئی تھیں کیونکہ رات کو ٹھنڈک بڑھنے کا احتمال تھا۔ آگ جلا کر ہم سب حقیقتاً گھوڑے بیچ کر سو گئے۔ علی الصبح راقم تقریباً پانچ بجے ''کمرہ یا بکریوں کے باڑے'' سے باہر نکلا تو اپنے آپ کو ہر طرف سے خوبصورت برف پوش چوٹیوں میں گھرا ہوا پایا۔ یعنی کہ شمال میں پامیر (واخان کا علاقہ)، جنوب میں قراقرم جو کہ بلندی میں قدرے زیادہ تھیں اور شرقاً قراقرم اور غرباً ہندوکش کا نظارہ تھا۔ پہاڑوں کا نظارہ جیسے کے پہلے

شونج کی آماجگاہ

شونج کی صبح

بادلوں سے اٹا ہوا پامیر

شونج سے روانگی

بیان کیا جا چکا ہے علی الصبح ہی صاف اور واضح ہوتا ہے کیونکہ اُس وقت evaporation & condensation کا عمل نہیں ہوتا۔ اِسی وجہ سے کوہ پیماؤں کا چوٹی سر کرنے کا عموماً وقت صبح ایک یا دو بجے سے چار بجے تک کے درمیان واپس آنے کا ہوتا ہے۔ اِس دوران احباب بھی جاگ چکے تھے اور سامان کو بھی باندھا جانے لگا۔ ہمارے میزبان اِس دوران ایک عدد بکری کی ران کے ساتھ نمودار ہوئے جو اُنہوں نے رات کو ہمارے لیے بچا کر رکھ لی تھی کہ یہ ہمارے آئندہ کے سفر کے لیے کام آئے گی۔ موسم نہایت ٹھنڈا ہونے کی وجہ سے اِس کی حالت ایسی تھی جیسے کہ فریزر میں رکھی گئی ہو۔ اِن کے دو بیٹے اپنے دو گدھوں کے ساتھ بھی آ گئے اور سامان لادا جانے لگا۔ ہم نے صرف چاکلیٹ اور بسکٹ وغیرہ پہ اکتفا کیا۔ ''کمرہ'' میں رات گذرانے کا کرایہ مبلغ پانچ سو روپے یعنی کہ بکری کی قیمت اور پکوائی مبلغ تین ہزار روپے ادا کی گئی۔

شونٔج سے سوختر آباد تک

ہم اپنے اگلے پڑاؤ سوختر آباد کے لیے مورخہ ۲۷ جولائی ۲۰۱۲ء ساڑھے آٹھ بجے صبح روانہ ہوئے۔ موسم بالکل صاف ہو چکا تھا اور جناب گل نذر خان اور دو گدھوں کی معیت میں ہم اپنے سفر پر روانہ ہوئے۔ یہ ایک خوشگوار لیکن طویل سفر تھا۔ ہمیں پچھلے سارے راستہ کی طرح وادیوں، تنگ گھاٹیوں، لمبے میدانوں اور اُونچے نیچے ٹیلوں سے نبرد آزما ہونا پڑا۔ ہمارا مسلسل سفر مشرق کی طرف تھا اور ہمیں تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ ہی ہوا تھا کہ ہمارے سامنے راستہ تنگ گھاٹی میں تبدیل ہو کر بند ہو گیا۔ یعنی کہ مشرق میں راستہ ندارد، شمال میں اُونچے پہاڑ اور جنوب میں دریا جو کہ ایک ندی کی صورت ایک بڑے گلیشیئر میں سے اپنا راستہ بنا رہا تھا۔ یہ چتبوئی گلیشیئر تھا اور ہمیں سوختر آباد پہنچنے کے لیے اِسی گلیشیئر سے ہو کو کر گذرنا تھا۔ ہم میں سے راقم کے علاوہ سب احباب کا برفیلے گلیشیئر کو عبور کرنا پہلا تجربہ تھا۔ یہاں کیمرہ میں محفوظ کرنے کے لیے بہت کچھ تھا۔ گلیشیئر پر پھسلن سے بھرپور عموداً چڑھائی سے اِس سفر کا آغاز ہوا۔ جس میں جابجا گہری دراڑیں بکھری ہوئی تھیں۔ Galcial Crevices برفیلی دارڑیں جو کہ چند فٹ سے کئی سوفٹ گہری ہو سکتی ہیں نہایت خطرناک ہوتی ہیں اور گلیشیئر کی اِن دارڑوں سے گذرنے کے لیے نہایت احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔ کبھی بھی دراڑ کے کے نزدیک نہ کھڑے ہوں کیونکہ اُس کی کیفیت اور مضبوطی کا آپ کو اندازہ نہیں ہوتا۔ اگر دراڑیں ایک سے زیادہ ہوں اور آپ زیادہ لوگ ہوں تب ایک دوسرے کو رسہ سے باندھ لینا مستحسن عمل ہے۔ خدانخواستہ اگر کوئی دراڑ میں گر جائے تو جلد از جلد اِس تک رسائی حاصل کرنا فوری اَمر ہے کیونکہ دراڑیں برفیلی ہیں اور اِنسانی جسم زیادہ درجہ حرارت پہ ہونے کی وجہ سے دراڑ میں خود بخود اپنا راستہ بنا تا نیچے ہی نیچے چلا جاتا ہے۔ اور دراڑ کے اندر درجہ حرارت کم ہونے کی وجہ سے hpothermia کا چانس بڑھ جاتا ہے اور اِنسان کے فوراً بے ہوش ہونے کا خطرہ ہوتا ہے جو کہ نہایت

اندوہناک صورت حال ہے۔ اگر فوری طبی امداد نہ مل سکے تو دراڑ کے شکار شخص کی موت صرف چند منٹ میں واقع ہو جاتی ہے۔ موسم اگر خراب ہو یعنی کہ اَبر آلود ہو تو گلیشیئر کو پار کرنا حماقت کے مترادف ہے کیونکہ پھسلن کے ساتھ ساتھ برف کی حالت بھی متغیر ہو جاتی ہے۔ قدرت نے جانوروں کو اِنسانوں سے زیادہ حس دی ہے اور یہ کبھی بھی گلیشیئر کے اُس حصے کی طرف نہیں جاتے جس کی سطح خطرناک یا باریک ہو۔ اِس کا عملی تجربہ بھی ہمیں ہوا جب ہمارے سامان سے لدے گدھے ہمارے لیے رہنما ثابت ہوئے۔ اُونچائی پر بعض اوقات سانس میں بے ترتیبی ہو جائے تو تھوڑی سی گلیشیئر برف اُٹھائیں اور اِسے چوسیں۔ اِس کو آپ اکسیر پائیں گے۔ خیر ہم اِس گلیشئر میں داخل ہوئے اور اس کے درمیان میں پہنچتے ہی ہمارا راستہ ایک نہایت خطرناک Crevice کی صورت میں سامنے آ گیا۔ ہمارے گذرنے کے لیے جگہ نہایت تنگ اور دو برف کی سلوں کے درمیان تھی۔ جیسے کہ پہلے بیان ہو چکا ہے ہمارے بار برداری کے جانور اِس راستہ سے گذرنے کے لیے تیار نہ تھے اور مسلسل ہنہنا کر پیچھے مڑ رہے تھے۔ لیکن ہمارے پاس اس راستہ سے ہو کر گذرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔ گدھوں سے سامان اُتارا جانے لگا اور پہلے پہل اُنہیں ہی گذار کر محفوظ مقام تک پہنچا دیا گیا۔ اُس کے بعد سامان ایک ایک کر کے اِنسانی کاوش سے وہیں پہنچ گیا۔ اب ہم اِنسانوں کی باری آئی۔ آپ کو دو برف کی دیواروں پر پاؤں جما کر Crevice کے اُوپر سے ہو کر گذرنا پڑ رہا تھا جو کہ ہم سب کے لیے ایک پر خطر اور adventurous اَمر تھا۔ کسی ناخوشگوار واقعہ کے بغیر ہم اِس مشکل سے ایک ایک کر کے نکل آئے۔ ہمیں گلیشیئر کو عبور کرنے میں تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ لگ گیا حالانکہ اس کا فاصلہ ڈیڑھ سے دو کلومیٹر تھا۔ اِس کے بعد ہمیں راستہ نہایت سہل لگنے لگا۔ سوختر آباد پہنچنے کے لیے آپ کو اس بڑے گلیشیئر جسے اِسی علاقہ کے نام سے سوختر آباد گلیشیئر کا نام دیا جاتا ہے سے گذرنا پڑتا ہے اور ساتھ ہی ایک چھوٹے گلیشیئر کو بھی عبور کرنا پڑتا ہے۔ اِن کے بعد سفر سہل لیکن طویل ہے۔ جب سفر طویل ہو تو تھکاوٹ بھی اپنا اثر ڈالتی ہے۔ ہم اِس طویل سفر کے بعد تقریباً چار بجے شام سوختر آباد پہنچے۔ یہاں گلگت ۔بلتستان حکومت کی عملداری ایک پولیس چیک پوسٹ کی صورت نظر آئی۔ آصف عمار بار برداری والوں کے ساتھ سب سے پہلے یہاں پہنچے اور حکومتی اہل کاروں کے ساتھ تعارف اور میل جول کا مرحلہ طے کر لیا۔ ڈاکٹر عبداللہ خان، فیض اللہ خان اور عبیداللہ خان دوسرا گروپ تھا اور راقم گل نذر خان کے ساتھ سب سے آخر میں یہاں پہنچا۔ چیک پوسٹ سے چند گز پہلے گل نذر نے راقم کو کچھ ''ادوایات'' morphine اپنے پاس رکھنے کے لیے دیں اور ساتھ ہی اِس حکمت

ایک ڈھلوان ۔سوختر آباد سے پیاخین

سوختر آباد سے پیاخین کے لیے روانگی

سوختر آباد پولیس پوسٹ کے اہلکاروں کے ساتھ

غروب آفتاب ۔سوختر آباد

سے آگاہ کیا کہ کہ پولیس اہلکار مقامی افراد کی جامہ تلاشی لیتے ہیں اور ہم اِس سے مستثناء ہوں گے۔ یہ ادویات دراصل منشیات کے ضمرے میں آتی تھیں۔ راقم کو انہیں اپنی جیب میں ڈالنے میں ذرا برابر بھی تامل نہ ہوا اور بعد میں پولیس اہلکاروں سے تعارف اور حال احوال میں کوئی مسئلہ نہ ہوا۔ راقم نہایت تھک چکا تھا پس پولیس چوکی کے ساتھ ہی بنی ایک مسجد جس کے بارے میں شوئنج کے محمد خان نے ہمیں پہلے سے آگاہ کر دیا تھا جا کر تقریباً آدھ سے پون گھنٹے کے لیے سو گیا۔ شوئنج سے سوختر آباد کا فاصلہ آڑھائی پڑاؤ شمار کیا جاتا ہے۔ پس مبلغ ۵۰۰۰ روپے باربرداری کے لیے ادا کر دیئے گئے اور یہ حضرات واپس روانہ ہو گئے۔ سوختر آباد بھی پاکستان کے نہایت شمال کا علاقہ ہے جو کہ واخان کے ساتھ متصل ہے۔ درمیان میں گلگت دریا ہے جو کہ اِن چھوٹے علاقوں سے گذرنے کی وجہ سے انہی کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ دریا کا رُخ مغرب سے مشرق کے طرف ہے اور شمال میں ہندوکش کا پہاڑی سلسلہ پاکستان کو افغانستان کے علاقہ واخان سے علیحدہ کرتا ہے۔ یہاں آبادی منتشر اور قلیل ہے۔ پورے شمال کی طرح اسماعیلیوں کی آبادی زیادہ ہے۔ پولیس چوکی کے اہلکار نہایت خوش اخلاق اور معاون تھے۔ چوں کہ ہم بری طرح تھک چکے تھے اِس لیے احباب نے پولیس اہلکاروں سے عندیہ لیا کہ کیا وہ ہماری کھانے پکانے میں مدد کر سکتے ہیں؟ اُن کا مثبت جواب ہمارے لیے نہایت خوشگوار تھا اور فوراً ہی بکری کی ران اُن کے حوالے کر دی گئی۔ مغرب کے وقت اِن بھائیوں (پولیس) نے ہمیں کھانے کے تیار ہونے کی نوید دی۔ پس ہم سب اُن کی چوکی میں کھانا تناول کرنے پہنچے۔ ہمارے لیے پلاؤ اور یخنی اپنی لذت اور اُن کی مہارت وسلیقہ کے منہ بولتے ثبوت کے ساتھ دعوت نظارہ دے رہی تھی۔ اِس کھانے کی ترتیب ونفاست ہمارے لیے ایک خوش گوار حیرت کا باعث محسوس ہوئی۔ کافی دِنوں کے بعد ہمارے لب ودہن اعلیٰ ذائقہ سے ہمکنار ہوئے۔ ہم سب نے خوب پیٹ بھر کر کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد اُنہوں نے ہماری چائے سے تواضع کی جس نے کھانے کا لطف دُوبالا کر دیا۔ گپ شپ کے دوران سماجی حوالوں سے بات چیت ہمارے لیے سیر حاصل تھی۔ چوکی کے کماندار، جو کہ اسماعیلی فرقہ سے تعلق رکھتے تھے اپنے علاقہ کے رسوم ورواج سے آگاہ کیا جو کہ عمومی طور پر پورے گلگت بلتستان کی طرح تھے لیکن ایک خاص بات اُنہوں نے موسم کی خوبصورتی اور انگور کی کثرت سے پیداوار اور اِس سے شراب کشید کرنے کی کی۔ اُن کے مطابق مہمان کے لیے فوری طور پر پیش کیا جانے والا مشروب یہی ہوتا ہے۔ یعنی کہ اُن کے ہاں جنتی مشروب عام تھا۔ ہماری تنقید پہ اُنہوں نے بتایا کہ انگور کی کثرت اور آمدورفت کے ذرائع نہ ہونے کی وجہ سے اُن کے پاس اِس کے

سوا کوئی حل نہیں کہ وہ اِس کے رَس سے یہ مشروب بنائیں۔ خیر ہمیں اپنے سفر کے اگلے مرحلہ کی بھی تیاری اور انتظام و انصرام بھی کرنا تھا۔ عمار آصف پہلے ہی سے دو گجر حضرات کو اپنے تین گدھوں کے ساتھ مختص کر چکے تھے کیونکہ ہمارا آئندہ کا سفر یہاں (سوختر آباد) سے مشینی سواری Vehicular transport کے ملنے تک کا تھا۔

سوختر آباد سے پیاخین تک

مورخہ ۲۸ جولائی ۲۰۱۲ء سات بجے صبح ہلکے پھلکے ناشتے جو کہ چائے اور بسکٹ پہ مشتمل تھا کے بعد ہم اپنے اگلے پڑاؤ بیلین ویلی سے ہوتے ہوئے پیاخین کے لیے روانہ ہوئے۔ پولیس پوسٹ سوختر آباد کے تمام سٹاف کے ساتھ ہم نے گروپ فوٹو بنائے اور رخت سفر ابھی ہم گدھوں پر باندھ ہی رہے تھے کہ ایک عجیب صورت حال سے دوچار ہونا پڑا۔ ایک شخص جن کا نام علی جوہر تھا نائب صوبیدار پولیس چوکی کے ہمراہ تشریف لائے اور ہم سے تقاضا کیا کہ وہ ہمارے ہم سفر اور پورٹر porter کے فرائض اِس لیے سرانجام دیں گے کہ یہ اُن کا حق بنتا ہے کیونکہ وہ یہاں تشریف لائے ہیں اور اب واپس جانے کے لیے وہ ہمارے لیے یہ ''خدمت'' سرانجام دیں گے جس کا یقیناً ہم اُنہیں معاوضہ پڑاؤ کے حساب سے ادا کریں گے۔ موصوف ایک بااثر اسماعیلی خاندان کے چشم و چراغ تھے جو کہ پولیس چوکی کے خورد ونوش کو پہچانے کی ذمہ دار تھی۔ یعنی کہ وہ ایک ٹھیکیداری contract کی صورت میں یہ خدمت سرانجام دیتے تھے۔ ہمارے گدھوں کے حضرات نے اُن کی اِس حرکت پہ کافی چہ بچیں کی لیکن جب پولیس چوکی کے نائب صوبیدار صاحب ساتھ ہوں تو اُن کی دال کیسے گل سکتی تھی۔ پس یہ طے پایا کہ ایک گدھا خالی جائے گا چونکہ ہم اِن حضرات کو دو گدھوں کی ادائیگی کریں گے اور یہ حضرت (علی جوہر) صاحب بیس کلو (جو کہ ایک پورٹر کے لیے مختص ہے) وزن اُٹھائیں گے۔ پس ہمارا قافلہ پیاخین کے لیے صبح سات بجے روانہ ہو گیا۔ عمار آصف کی ''دوستی'' کے فرائض گدھے والوں کے ساتھ تفویض ہوئے کیونکہ ہمارے رہنما guide محترم گل نذر خان نے ہمارے کانوں میں یہ بات ڈال دی تھی کہ بعض ایسے واقعات سامنے آئے تھے کہ باربرداری کے افراد نے اپنی ضرورت کا سامان راستے میں ہی نکال لیا تھا۔ خیر ہمارے سفر میں ایسا کوئی واقعہ رونما نہیں ہوا۔ یہ شاید اِس لیے بھی ہو کہ اِسماعیلی اور سُنی گجر برادری

گلیشیئر میں احباب

سوختر آباد گلیشیئر

گلیشیئر کی دراڑیں

گلیشیئر کی تنگ گھاٹیاں

میں سیاسی ومعاشی تنگ ودو اِس علاقہ کا خاصہ ہے۔ اسماعیلی جو کہ آبادی میں زیادہ ہیں تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ ساتھ کاروباری بھی ہیں جب کہ گجر کا زیادہ گذر اوقات محنت مزدوری اور بھیڑ بکری پر ہے۔ یہ ناخواندہ اور سیاسی طور پر بھی کمزور ہیں۔ یہ سفر اگر چہ زیادہ بلندی پر نہیں تھا لیکن اپنی طوالت اور مختلف terrain سے بھرپور تھا۔ شروع میں وادیوں اور گھاٹیوں سے واسطہ رہا جو کہ نہایت سرسبز تھیں پھر سنگلاخ چٹانیں ہمارے اِستقبال کے لیے موجود تھیں اور تقریباً دو گھنٹے کے سفر کے بعد محترم عمار آصف بھی ہمارے ساتھ ہو گئے کیونکہ باربرداری کے حضرات نے دریا کے راستے (یعنی کہ وادی) سے جانا تھا جب کہ ہم نے پہاڑ کے ساتھ ساتھ چھوٹے راستے shortcut سے آگے بڑھنا تھا۔ یکا یک ہمارے سامنے پہاڑ سے متصل پگڈنڈی والا راستہ ختم ہو گیا۔ ہم وادی سے تقریباً پانچ ہزار فٹ اُونچائی پر تھے جب کہ وادی میں دریا بہ رہا تھا اور ساتھ ہی کچھ مقامی آبادی کے پتھروں سے بنے گھر بھی ہم اِس بلندی سے دیکھ سکتے تھے۔ ہمارے سامنے ایک عمودی پتھریلی چٹان پینتالیس ڈگری کے زاویہ بنائے کھڑی تھی جس کے ایک طرف پتھر کی دیوار اور دوسری طرف پانچ ہزار فٹ گہری وادی تھی۔ چٹان پر جڑی بوٹیاں عنقا! ہم سب ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے کہ ہمیں کس راستہ کا انتخاب کرنا ہے۔ علی جوہر نے اپنے آپ کو اِس دوران سامان سے ہلکا کرنا شروع کیا اور ایک سفری تھیلے کو لے کر اُسی چٹان پر چڑھنے لگے تو ہمیں معلوم ہوا کہ یہی ہماری منزل ہے اور یہیں سے ہی ہو کر ہمیں گذرنا ہے۔ ہم میں سے محمد فیض اللہ خان نے پہل کی اور علی جوہر کے پیچھے روانہ ہوئے اِن کے بعد عبید اللہ خان نے ہمت کی اور پھر راقم۔ ڈاکٹر عبداللہ خان اور سب سے آخر میں عمار آصف۔ یہ سفر تقریباً تین سو میٹر کا تھا اور اِسی طور ہمیں نیچے اُترنا تھا۔ چٹان کی دوسری طرف راستہ قدرے بہتر تھا وہاں سب احباب کا انتظار کیا جانے لگا۔ یہاں نظارہ کمال کا تھا۔ نیچے دریا ایک بہت بڑے گلیشیئر میں داخل ہو رہا تھا اور اس کا دہانہ ایک پھاٹک کی صورت نظر آ رہا تھا۔ ابھی ہم اِس نظارہ سے لطف اندوز ہو ہی رہے تھے کہ یکا یک ایک خوفناک گڑ اگڑاہٹ ہوئی اور گلیشیئر کا دہانہ ایک بہت بڑی برفیلی چٹان کے گرنے سے بند ہو گیا۔ اس پورے عمل میں جو کہ چند لمحوں سے زائد نہیں تھا سے قدرت کی طاقت کا اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا۔ ہم نے اپنے کیمرے فلم بندی کے لیے تیار کیے ہی تھے کہ ایک اور زوردار گونج ہوئی اور ایک اور برفیلی سل کے گرنے کا عمل ہم نے پانچ ہزار فٹ کی بلندی سے محفوظ کر لیا۔ گل نذر خان اِس صورت حال میں کافی پریشان نظر آ رہے تھے۔ اِنھوں نے فرمایا کہ دریا کے راستہ کی بندش کی وجہ سے پانی کی سطح بلند ہو گی اور اِردگرد کے چند گھروں میں فوری سیلاب کا خطرہ

کرومبر گلیشیئر

یاک سامان اُٹھائے ہوئے

حدود خیبر پختونخواہ اور گلگت بلتستان ۔ کرومبر لیک

کرومبر لیک

ہے۔چشم زدن میں ہم اِسی صورت حال کے مدعی بھی بن گئے ۔ یہ عوامل یہاں عموماً ہوتے رہتے ہیں اور مقامی آبادی ایسی صورت حال سے نبرد آزما ہونے کی صلاحیت بھی رکھتی ہے اور اپنی مدد آپ کے تحت معاملات سنوار لیتی ہے۔ دریا اپنا راستہ پھر بنا لے گا گر چہ اِس میں چند روز لگ سکتے ہیں۔گل نذر خان نے شمال کی طرف اِشارہ کرتے ہوئے ہمیں چلنجی پاس Chillinji Pass کی طرف توجہ دلائی ۔ یہ برف سے مکمل اَٹا ہوا تھا اور ہمارے اور اِس کے راستہ میں دریا حائل تھا اور یہ باون سو میٹر پر پرشکوہ انداز میں موجود تھا۔ اگر آپ اِس پاس کو عبور کریں تو آپ بابا غنڈی سے ہوتے ہوئے ''سست'' جا نکلتے ہیں جہاں سے خنجراب چالیس کلومیٹر پر ہے۔کچھ ستانے کے بعد ہمارا سفر آگے بڑھا۔اَب ہمارے سامنے پینتیس ڈگری کی اُترائی تھی جو کہ مٹی اور پتھروں سے اٹی ہوئی تھی ۔ یہ ایک مشکل سفر تھا اور چند سو میٹروں کا سفر ہمارا کافی وقت لے گیا۔ یہاں سے ہم ایک اور گلیشئیر میں داخل ہوئے جو کہ چتبوئی گلیشئیر سے کافی چھوٹا تھا لیکن اپنی Crevices سے اُسی طرح پر تھا۔ یہ سوختر آباد گلیشئیر کے نام سے جانا جاتا ہے۔گلیشئیر چھوٹا یا بڑا نہیں ہوتا اور آپ کو اِسے بھی سنجیدگی سے لینا اور احترام کرنا ہے کیونکہ کسی قسم کی لغزش مہلک حادثہ پہ منتج ہو سکتی ہے۔گلیشئیر ختم ہوتے ہی دریا کے ساتھ سفر کرتے ہوئے ہمیں ایک بڑے میدان سے گذرنا پڑا اور چند گھنٹوں کے سفر کے بعد ہم ایک سرسبز میدان پہنچ گئے جس کا جنگل حضرتِ انسان کی ہوس کا شکار نظر آ رہا تھا۔ جا بجا درخت کاٹ کر hut ہٹ بنائے گئے تھے اور بے دریغ درختوں کو برباد کیا گیا تھا۔ اِستفسار کرنے پر معلوم ہوا کہ نیشنل جیوگرافک اور بی بی سی کے لیے ہمارے پاکستان کے ناصر ملک کا یہ کارنامہ تھا جو اُنہوں نے پاکستان کے اِس علاقہ کو متعارف کرانے کے لیے سرانجام دیا۔ یہ علاقہ یٰسین ویلی میں شامل کیا جاتا ہے۔ یہاں سے راقم ،عمار آصف اور باربرداری کے افراد کے ساتھ آگے نکل گئے جبکہ ڈاکٹر عبداللہ خان، فیض اللہ خان، عبیداللہ خان، گل نذر خان اور علی جوہر پیچھے رہ گئے ۔ یہاں بلند پہاڑی عبور کرنے کے بعد آپ ایک حسین وادی یٰسین ویلی میں پہنچتے ہیں جو کہ ابھی تک انسانی دسترس سے باہر تھی اور ایک گھنے جنگل میں گھری ہوئی ایک خوش کن نظارہ دے رہی تھی۔تھکن سے چور ہم اِس وادی میں پہنچے تو خواہش ہوئی کہ یہاں ڈیرے لگا دیئے جائیں لیکن ہمارے رہنما گدھے والے حضرات نے فرمایا کہ آئندہ سفر کو بہتر طور پر سرانجام دینے کے لیے ضروری ہے کہ ہم پیاخین جا کر اپنے کیمپ لگائیں۔پس مرتے کیا نہ کرتے کے مصداق ''والئ'' یٰسین ویلی کے ہاتھ ہم نے پیغام چھوڑا کہ اِس فیصلہ سے ہمارے ساتھیوں کو آگاہ کر دیا جائے۔ یہ صاحب اپنے آپ کو اِس

وادی کا مالک کہہ رہ تھے اور اپنی نسل واخی فرما رہا تھے۔ اِن کا خاندان وادی میں نہیں بلکہ وادی سے اُوپر ایک محفوظ مقام پر تھا اور یہ اپنے مال مویشیوں کے ساتھ یہاں کے والئی تھے۔ پس ہم یٰسین سے آگے بڑھ گئے۔ یٰسین ویلی سے پیاخین کا فاصلہ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے کا تھا لیکن راستہ کے کچھ امتحان ابھی باقی تھے۔ اِس دفعہ گرچہ اُونچائی تو زیادہ نہیں تھی لیکن ایک طرف ٹھاٹھیں مارتا ہوا دریا تھا اور دوسری طرف سنگلاخ چٹان پر پتھر اور لکڑیاں جوڑ کر راستہ بنایا گیا تھا جہاں پہلے گدھوں سے سامان اُتار کے حضرتِ انسان نے خود اُٹھایا اور پھر گدھوں کو گذار کر ہمارا گروپ آگے بڑھ گیا۔ آخر کار ہم شام پانچ بجے پیاخین پہنچ گئے۔ اور جاتے ہی دونوں کیمپ لگائے تا کہ ہمارے ساتھی جن کی حالت لازماً ہم سے مختلف نہ ہوگی کو دِقت نہ ہو۔ لیکن کیمپ ایستادہ کر کے عمار آصف اور راقم فارغ ہی ہوئے تھے کہ ہمارے ساتھی بھی آ پہنچے۔ سارے دِن کی طویل ترین مسافت کے بعد ہم سب نہایت تھک چکے تھے لیکن بھلا ہو فیض اللہ خان کا چائے اور بسکٹ نے جان میں جان ڈال دی۔ دیگر حاجات سے فارغ ہونے کے بعد کھانے کی ڈھنڈیا پڑی۔ ہمارے لیے ایک دفعہ پھر فیض اللہ خان نے اپنی خدمات واکیس اور نوڈلز، چائے، بسکٹ وغیرہ سے پیٹ پوجا کرنے کے بعد سب اپنے اپنے ''کمروں'' میں خواب آغوش میں چلے گئے۔ پیاخین بھی اِس پورے علاقہ کی طرح چند سو نفوس پہ مشتمل ایک گاؤں ہے۔ ہمارا کیمپ پیاخین پرائمری اسکول کے بالمقابل ایستادہ تھا اور شمال میں دریا گلگت اپنی پر جوش لہروں کے شور کے ساتھ اپنی موجودگی کا احساس دلا رہا تھا۔ رات بہت ہی جلد گزر گئی اور ہم سب علی الصبح جاگ گئے۔

پیاخین سے بورتھ، گنج آباد تک

ہلکے سے ناشتے کے بعد ہم مورخہ ۲۹ جولائی ۲۰۱۲ کو صبح سات بجے پیاخین سے بورتھ کے لیے روانہ ہوئے۔ علی جوہر پورٹر کے طور اور دوسرے احباب اپنے دو گدھوں کے ساتھ ہمارے سامان کو لاد چکے تھے۔ ہمیں اطلاع دی گئی کہ آج ہمیں اپنے سفر میں دریا کو بھی عبور کرنا ہوگا۔ خیر یہ سفر نسبتاً سہل تھا اور طوالت بھی زیادہ نہیں تھی۔ دریا کو دو سے تین مقامات پر عبور کرنا پڑا جو کہ کوئی مشکل اَمر نہ تھا۔ سورج کے چڑھنے کے ساتھ ہی تمازت میں اضافہ ہو گیا اور اِس سے رفتار پہ خاطر خواہ اثر پڑا۔ پیاخین سے نکلتے ہی ہماری چند اشخاص سے ملاقات ہوئی جن میں چند علی جوہر کے ملازم تھے جنھوں نے فوراً ہی اِس سے ہمارا سامان لے لیے اور چلتے بنے اور دوسرے اِس کے بڑے بھائی علی تھے۔ عمار آصف گدھے والوں کے ساتھ ہو گئے، راقم، عبیداللہ خان اور علی ایک ٹولی میں بٹ گئے جبکہ ڈاکٹر عبداللہ خان، فیض اللہ خان اور گل نذر خان سب سے آخر میں تھے۔ راستہ میں شمال کی طرف ایک چوٹی نظر آئی جسے علی نے چھوٹی K-2 سے تعبیر کیا اور واقعتاً وہ ایسے ہی تھی۔ یہ پورا علاقہ مترم داس یا محترم داس کے نام سے منصوب ہے۔ تقریباً تین گھنٹوں کی مسافت کے بعد جو کہ ۱۶ سے ۱۷ کلومیٹر کے قریب تھی ہم مترم داس کے اسکول اور خاص گاؤں جو کہ اِس پورے علاقہ کی طرز پر چھوٹی سی آبادی پہ مشتمل تھا میں پہنچے تو علی نے بتایا کہ علی جوہر اور اس کے خاندان پہ مشتمل یہ گاؤں ہے اور یہاں سے آگے ہمیں اکیلے جانا ہوگا۔ یہ گاؤں بورتھ میں شمار کیا جاتا ہے اور یٔشین ویلی (ایشکومن) میں آتا ہے۔ ٹریک میں پہلی دفعہ ہمیں بجلی کے پول نظر آئے جس سے یہ اندازہ ہوا کہ ہم ایک دفعہ پھر شہری سہولتوں کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ علی نے رہنمائی کی کہ اب راستہ سیدھا ہے۔ بورتھ سے دو کلومیٹر پہلے ہالینڈ کی حکومت کے تعاون سے کئی سو ایکڑ پر درخت لگائے گئے تھے جو کہ انسانوں کے معاشرے کی اجتماعی کاوش کا منہ بولتا ثبوت تھی حالانکہ جن کے یہ اثاثہ ہیں وہ اِن درختوں کے

یٰسین ویلی

یٰسین ویلی میں درخت کشی

پیاخین میں خیمہ تن

پیاخین کا راہ

در پے ہیں ۔اس کا واضح ثبوت ہم یٰسین ویلی میں درخت کشی کی صورت دیکھ چکے تھے۔تقریباً ایک گھنٹے کی مسافت کے بعد یعنی کہ دو پہر بارہ بجے ہم خاص بورتھ پہنچ گئے اور عمار آصف ہمارے لیے پہلے ہی سے ایک مسجد میں پڑاؤ ڈال چکے تھے۔مسجد ایک بڑے احاطے پہ مشتمل اور اچھے انداز سے بنائی گئی تھی ہمیں پورٹرز نے بتایا کہ اُنھوں نے عوام الناس سے چندہ اکٹھا کر کے اللہ کا گھر تعمیر کیا ہے حالانکہ آبادی کی اپنی رہائش کی حالت کوئی اتنی اچھی نہ تھی۔خیر یہ تو اللہ کی زمین ہے اور ''اپنے'' گھر کے لیے وہ انسانوں اور دُنیاوی لوازمات کا ہرگز محتاج نہیں۔ڈاکٹر عبداللہ خان و فیض اللہ خان گل نذر کے ساتھ ابھی نہیں پہنچے تھے کہ ہمارے پورٹرز حضرات نے تقاضا کیا کہ اُنھیں فارغ کر دیا جائے۔پس اُنھیں پونے چار پڑاؤ کے حساب سے ادائیگی کر دی گئی۔علی جوہر کے اِصرار پر اسے چار پڑاؤ کی ادائیگی کر دی گئی اور وہ ہم سے روانہ ہو گئے۔اُن کے جاتے ہی گل نذر کی معیت میں ہماری تیسری پارٹی بھی پہنچ گئی۔ہم اپنے سامان کھول کر سیٹ کر چکے تھے کہ گل نذر خان نے ہم سے سوال کیا کہ ہم یہاں کیوں رُکے ہیں تو بتایا گیا کہ ہمارے رہنماؤں یعنی کہ پورٹرز نے یہی تجویز کیا تھا۔اس پر وہ نہایت ناراض ہوئے اور فرمانے لگے کہ آپ کے اگلے سفر کے لیے گاڑی یہاں سے نہیں بلکہ گنج آباد سے ملے گی اور اُس کی بکنگ وہاں ایک دن پہلے ہی ہو جاتی ہے۔اس دُرفتنی کو دور کرنے کے لیے طے پایا کہ راقم ،فیض اللہ خان اور گل نذر خان گنج آباد جائیں اور وہاں سے گاڑی اسپیشل کر کے سامان کی ترسیل کی جائے۔ تقریباً ایک گھنٹے کی مسافت کے بعد ہم تینوں گنج آباد پہنچے اور اسپیشل گاڑی لے کر بورتھ آئے اور وہاں سے احباب و سامان گنج آباد منتقل کیا گیا اور اِس طرح ہمیں ۲۵۰۰ روپے اِضافی ادا کرنے پڑے۔خیر یہ انداز تو ''مارشل'' قوموں کی نشانیوں اور طرۂ امتیاز میں سے ایک ہے۔گنج آباد قدرے بڑا گاؤں ہے جو کہ یٰسین ویلی (اشکومن) کا حصہ ہے اور یہ شہری و قبائلی طرز زندگی کا متزاج ہے۔گنج آباد میں ہمارا قیام آغا خان فاؤنڈیشن کے اسکول کے اِحاطے میں تھا جہاں ہم نے اپنے کیمپ ایستادہ کیے۔شام کو گل نذر خان بھی ہمارے پاس تشریف لے آئے اور تفصیلاً حال احوال ہوا۔باتوں باتوں میں انسان کو پرکھنے کے حوالے سے فارسی زبان میں اُنھوں نے کہاوت بھی سنائی کہ زن درعلاق مرد در سہ فّہ مار کہ عورت کی اچھائی کا پتہ کنوئیں پہ چلتا ہے جہاں وہ پانی بھرنے جاتی ہیں اور اپنے گھر اور لوگوں کے بارے میں غلط یا صحیح بیان کرتی ہے جب کہ مرد کا پتہ سفر میں چلتا ہے۔کہاوتیں کیسے اپنا روپ و انداز اپناتی ہیں لیکن اُن کی روح وہی رہتی ہے جو انسانوں میں مشترک ہے۔

K-2!! مترم داس میں

اگلی صبح گنج آباد سے گا ہکوچ کے لیے اِمّت سے ہوتے ہوئے مورخہ ۳۰ جولائی کو ہم گلگت پہنچے۔ ہمارا یہ سفر یارخون سے گنج آباد تک آٹھ روز میں مکمل ہوا اور یہ ٹریک تقریباً ۱۴۰ کلومیٹر تھا۔

یارخون لشت سے گنج آباد تک آغا خان فاؤنڈیشن کے دیہی ہیلتھ سنٹر اور اپرئمری اسکول ہی آبادی کی جسمانی و ذہنی صحت کی آبیاری کرتے ہوئے نظر آتے ہیں جبکہ حکومت پاکستان اِس معاملہ سے لاتعلق محسوس ہوتی ہے۔ دُور افتادہ پہاڑی علاقوں میں ہر سال صحت اور خاص طور پر زچگی کی پیچیدگیوں کی وجہ سے زچہ و بچہ کی اموات عام ہیں اور اکثر اوقات مریض کو لے جانے کے لیے تند و تیز ندی نالوں سے گزر کر جانا ہوتا ہے۔ اِس دوران مریض اور تیماردار کا اِن لہروں کے سپرد ہو کر اپنی زندگی کو موت کے حوالے کرنا بھی عام ہے۔ علاقہ کے لوگ اِس حوالے سے بہت رنجیدہ نظر آئے۔ اُن کا عموماً سوال یہ ہوتا ہے کہ یہ علاقہ کیا پاکستان کا حصہ نہیں، اور کیا ہم پاکستانی شہری نہیں؟ لواری ٹنل کو ہی دیکھ لیں کہ ۷۰ کی دہائی میں اِس پر کام کا آغاز ہوا اُس کے بعد مختلف حکومتیں آتی جاتی رہیں اور پھر ''ڈیکٹیٹر'' پرویز مشرف کے دور میں کچھ پیش رفت ہوئی۔ اِس کے بعد اب تک کوئی توجہ نہیں۔ نتیجتاً چترال تقریباً تین سے چار ماہ زمینی طور پر پاکستان سے کٹ جاتا ہے اور علاقہ کے لوگوں کو افغانستان سے ہو کر پشاور آنا پڑتا ہے۔ ارباب اختیار کا اِس ملک کے حکمران بننے اِس ملک کا مال لوٹنے اور لوٹ کھسوٹ کو غیر ملک منتقل کرنے کے سوا کوئی ایجنڈا نہیں۔ حقیقت ہے کہ محمد علی جناح کے بعد اب تک ہم ایک حقیقی رہنما کے منتظر ہیں اور اِس معاملہ میں قحط الرجال کا شکار ہیں۔